March
2022

جدید ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

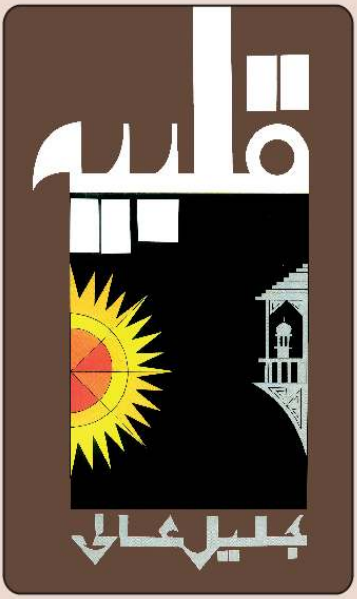
قلبیہ
جلیل عالی

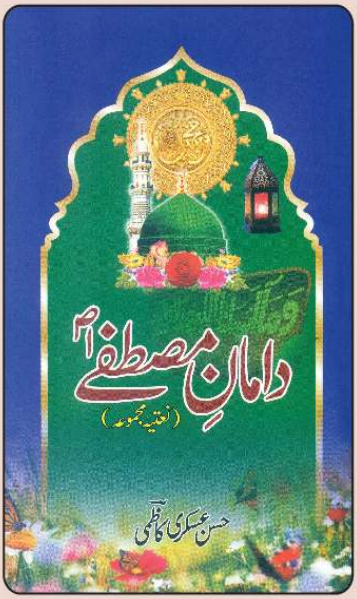
دامانِ مصطفےٰ
(نعتیہ مجموعہ)
حسن عسکری کاظمی

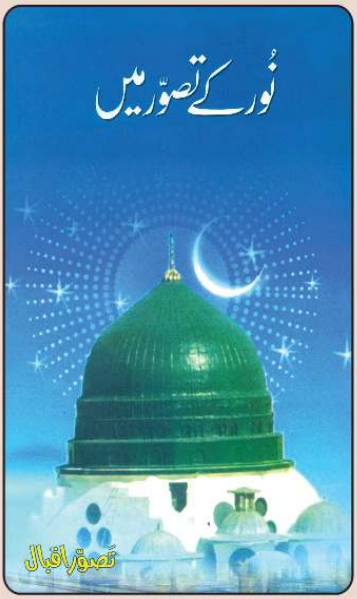
نُور کے تصوّر میں
تصوّر اقبال

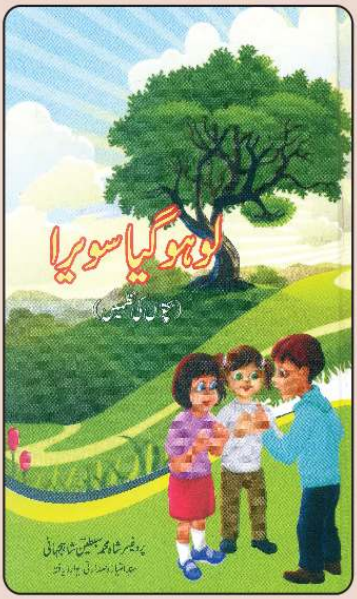
لو ہو گیا سویرا
(بچوں کی نظمیں)
پروفیسر شاہد سبطین شاہجہانی

آزاد

دنیا والے کب جانیں گے
جان بھی لیں تو کب مانیں گے
کس دھن میں راتیں کاٹی ہیں
کیا کیا دیواریں چاٹی ہیں
کیسے کیسے دن دیکھے ہیں
قاتل کس کے بِن دیکھے ہیں
بھاری بھاری زنجیروں میں
کومل کومل تقصیروں میں
کس نے پکڑا __ کس نے جکڑا
سکھ سپنے ، دُکھ اپنے

پھول چنے تھے
گیت بنے تھے
جنگل جنگل ، صحرا صحرا
بستی بستی گیت سنائے
گیت سنائے ، میت گنوائے
سُر بکھرے ، لَے ٹوٹی
دِل کیا؟ ہر شے ٹوٹی
لفظ ہوا میں کھو جاتے ہیں
سپنے سچے ہو جاتے ہیں

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - مارچ 2022 - شمارہ نمبر: 3

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خالد احمد، روحی کنجاہی، اجمل نیازی، بشریٰ رحمٰن

قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ

www.trackntie.com

BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے زریاب پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ بالمقابل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی	7
2	نعت	آصف ثاقب، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، محمد یٰسین قمر علی رضا احمد، اعجاز دانش، سرور حسین نقشبندی، محمود کیفی	8 تا 15
3	عقیدت	نسیم سحر، مرزا آصف رسول، پروین سجل	16 تا 18
4	ہائیکو	خاور اعجاز	19
5	وطن کے لیے	اعجاز رضوی	20
6	مضامین	محمد ارشاد، محمد افتخار شفیع، شاعر علی شاعر، عامر رضوی رانا سعید دوشی، سید تحسین گیلانی، تسنیم فردوس، اعجاز رضوی	21 تا 58
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	59 تا 67
8	رفتگاں	ہارون الرشید، ناصر بشیر، محمد شعیب مرزا	68 تا 77
9	افسانے	حامد یزدانی، عزیز عادل	78 تا 88
10	غزلیں	خالد احمد، محمد ارشاد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، خاور اعجاز، رشید آفرین ممتاز اطہر، محمد انیس انصاری، ناصر علی سید، عفدر صدیقی رضی، گلزار بخاری یعقوب پرواز، حسن عباس رضا، منظور ثاقب، احمد جلیل راحت سرحدی، ممتاز راشد لاہوری، حسنین بخاری، جمشید چشتی	89 تا 183

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	ہارون الرشید، حسنین سحر، ارشد شاہین، علی ارمان، ناصر بشیر شفیق احمد خان، شبہ طراز، طالب انصاری، افشاں سجاد شوکت محمود شوکت، ریاض ندیم نیازی، محمد نوید مرزا امتیاز الحق امتیاز، افروز رضوی، ذکی طارق، آصف شفیع فوزیہ تبسم، افتخار شاہد، محمد سلیم ساگر، شاہد ماکلی، رخشندہ نوید اشرف کمال، انصر حسن، عمران اعوان، اصغر علی بلوچ تصدق شعار، رحمان فارس، توقیر شریفی، علی حسین عابدی بشیر احمد حبیب، فخر عباس، رضا اللہ حیدر، ساگر حضور پوری آفتاب خان، واصف سجاد، نیاز جیراجپوری، اکرم جاذب ظہور چوہان، سید فرخ رضا ترمذی، سید ضیا حسین، صغیر احمد صغیر طلعت شبیر، ارشد محمود ارشد، عطا العزیز، نعیم رضا بھٹی ثمینہ سید، رخسانہ سمن، اسد اعوان، صدام ساگر، عنبرین خان ارسلان ساحل، فرہاد ترابی، رضی رضوی، آفتاب محمود شمس کاشف واصفی، امجد بابر، عاطف جاوید عاطف، عزم الحسنین عزمی علی آرش، دانش عزیز، سرفراز عارض، عاصم اعجاز، شہزاد احمد شاذ طاہر منیر طاہر، عقیل شافی، شہاب اللہ شہاب، محمد علی ایاز کوکی گل، اسد رضا سحر، راجہ عبدالقیوم، وسیم جبران، میتھیو محسن مظفر نقوی، کشور ثبات، زین علی رضوی، نعمان منظور	89 تا 183
11	شاعرِ امروز	تہذیب حافی، سعید شارق [شاہد ماکلی]	184 تا 188
12	طنز و مزاح / خاکے	نسیم سحر، علی رضا احمد، راجہ عبدالقیوم، سیدہ آمنہ ریاض	189 تا 201
13	نظمیں	امجد اسلام امجد، غلام حسین ساجد، خالد علیم، حامد یزدانی اقبال سروبہ، یوسف خالد، اکرم ناصر، رانا سعید دوشی طلعت شبیر، محمد نوید مرزا، سجاد بلوچ، عزیز فیصل اویس جمیل، زعیم رشید، اُم حبیب، خالق آرزو نعمان فاروق، گوہر اعوان، نائیلہ راٹھور	202 تا 221
14	خطوط	آصف ثاقب، نسیم سحر، ممتاز راشد لاہوری، سید ریاض حسین زیدی آفتاب احمد ملک، فیض رسول فیضان، اشرف کمال، محمد انیس انصاری طالب انصاری، ہارون الرشید، آفتاب خان، رانا محمد شاہد	222 تا 241

حمد

تو کہ ہے قادرِ مطلق تری قدرت کے نثار
ہر طرف تیری ہی عظمت کے ہیں پیدا آثار

تیری تخلیق کے انداز نرالے دیکھے
تو نے ہر رنگ میں پھولوں کے لگائے انبار

نیل گوں کتنی ہے خوش رنگ فلک کی چادر
کتنے سیارے، ستارے ہیں نہیں جن کا شمار

بحر و بر، شمس و قمر، کوہ و بیاباں تیرے
خوشنما کھیتیاں تا حدِ نظر ہیں اشجار

تیری مخلوق کی اقسام نہ گن پائے کوئی
اک زمانے سے ہے حیراں مری چشمِ بیدار

سب ترے زیرِ نگیں، تیرے کرم کے محتاج
وہ کہ صحرا ہوں، سمندر ہوں کہ اونچے کہسار

میں تیرا بندۂ بے دام ہوں میرے مولا!
تو ہے مالک مرا میں کیسے کروں گا انکار

نعمتِ شعر و سخن تو نے عطا کی مجھ کو
سرنگوں نوکِ قلم میرے گنہ کا اقرار

میں کہ ہوں حمد سرا حرف ہیں بے چہرہ مرے
تیری عظمت کا یقیں میرے ہنر کا اظہار

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

شفاعت کا قرینہ سامنے ہو
مروں جب میں مدینہ سامنے ہو

نظر میں نور بھر دے سبز گنبد
عقیدت کا نگینہ سامنے ہو

ہو دولت روشنی کی تن بدن میں
اجالوں کا خزینہ سامنے ہو

بھروں آنکھوں میں شمعوں کے صحیفے
کوئی ایسا شبینہ سامنے ہو

ہوں پس منظر میں باقی سب مہینے
ولادت کا مہینہ سامنے ہو

مدینے کا سفر ہو یوں مبارک
دعاؤں کا سفینہ سامنے ہو

جھلکتے ہوں "جواہر" غم کے ثاقبؔ
جو دل کا آبگینہ سامنے ہو

آصف ثاقب

نعتؐ

خُلقؐ جب خیر کو نکلا ہوتا
سر پہ اک ابر کا سایا ہوتا

ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اشجار
اُسؐ کو جس رہ سے گزرنا ہوتا

حُکمِ تازہ کے لیے وقت اکثر
اُسؐ کی دہلیز پہ بیٹھا ہوتا

نبضِ ایّام پہ انگلی رہتی
اور جیسا بھی وہؐ کہتا ہوتا

جان جاتا وہؐ بیاں سے پہلے
دل میں سائل نے جو سوچا ہوتا

وہؐ جو دھرتا نہ قدم دھرتی پر
قہر اِس دہر میں کیا کیا ہوتا

آدمی ربط جو رکھتا اُسؐ سے
ایسے اندر سے نہ ٹوٹا ہوتا

رہنما اُسؐ کو خرد جو کرتی
حل نہ پھر کون سا عقدہ ہوتا

مطلعِ مہرِ رسالتؐ کے بغیر
کب شبِ غم کا سویرا ہوتا

موجِ مدحت سے ہوا ہے گلزار
ورنہ سینہ وہی صحرا ہوتا

اُسؐ کے شایاں جسے کہتے عالی
کاش اک شعر تو ایسا ہوتا

جلیل عالی

نعتؐ

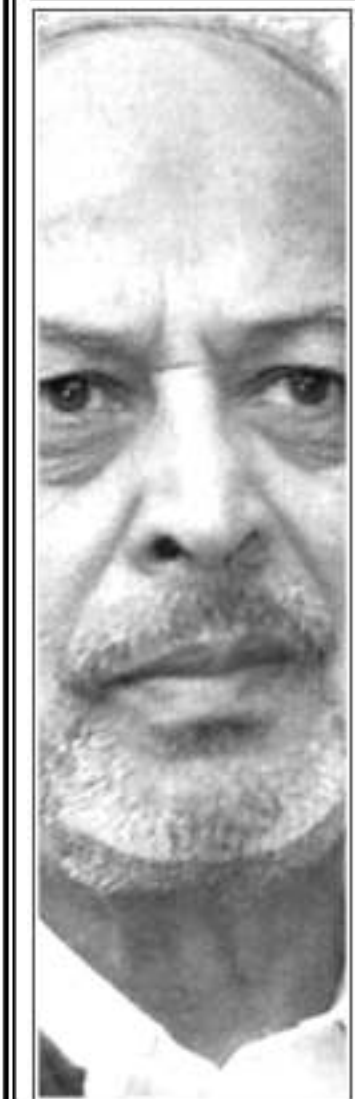

مدحِ سرکارِ مدینہ کا ارادہ کرنا
یہ عبادت ہے ، عبادت کا اعادہ کرنا

خوش نصیبی ہے اگر اذنِ حضوری مل جائے
اشک آنکھوں میں ہوں، طے عشق کا جادہ کرنا

باوضو ہو کے نگاہوں کو جھکانا ہو گا
انؐ کی دہلیز پہ سر اپنا نہادہ کرنا

اسوۂ سیّدؐ کونین رہے پیشِ نظر
خیر کا وزن ترازو میں زیادہ کرنا

غیر بھی آئے اسے اپنا بنانا ہو گا
انؐ کی تعلیم ہے دل اپنا کشادہ کرنا

دور سے تم کو نظر آئے اگر شہرِ نبیؐ
سر کے بل چلنا کبھی خود کو پیادہ کرنا

انؐ کے روضے پہ گزاروں میں حسنؔ عمرِ عزیز
سفرِ شوق کا اب جلد ارادہ کرنا

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

شاخِ امید پہ آیا ہے ثمر آخرِ کار
للہ الحمد کھلی چشمِ ہنر آخرِ کار

جل اٹھے دل میں ولائے شہِؐ بطحا کے چراغ
بقعۂ نور ہوا جاں کا نگر آخرِ کار

آپؐ آئے ہیں زمانے میں اجالے لے کر
ہو گیا ختم اندھیروں کا سفر آخرِ کار

پھیلتی جاتی ہے احساس میں طیبہ کی ضیا
شبِ آلام کی ہوتی ہے سحر آخرِ کار

سوچتے سوچتے سرکارؐ کی صورت ، سیرت
گم ہوا نور میں اک خاک بسر آخرِ کار

گو ہے ناواقفِ آدابِ گدائی لیکن
اُنؐ سے منسوب ہوا سائلِ در آخرِ کار

اے خوشا مجھ کو ملی دیدۂ تر کی دولت
وا ہوا میرے لیے بابِ اثر آخرِ کار

نعت کہتے ہوئے پہنچا ہے نبیؐ کے در پر
ذرّۂ خاک ہوا رشکِ قمر آخرِ کار

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

پڑا رہے گا اسی در پہ اب غلام ، مدام
کٹیں گے ان کے ہی کوچے میں صبح و شام، مدام

ثنائے سرورِ کون و مکاں مرا اعزاز
کیا ہے میں نے اسی روشنی کو عام مدام

کرم نبی کا سدا میرا دستگیر رہا
ہر امتحاں میں رہا ہوں میں شاد کام مدام

یہی غموں سے رہائی کی ایک صورت تھی
رہا لبوں پہ درود اور مرے سلام مدام

میں جب سے حسرت دیدار لے کے بیٹھا ہوں
کیا ہے آنکھوں نے اشکوں سے اہتمام مدام

یہ ٹھان لی ہے فقط ان کی نعت لکھوں گا
رہے گا نذر انھی کی مرا کلام مدام

جسے حضور کے فیضِ نظر سے نسبت ہے
چلے گا سارے جہاں میں وہی نظام مدام

علی رضا احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانچوں حواس آپ کے گھر کے غلام ہیں
سلطانِ پنج در ، خدمِ پنج تن تمام

نعتؐ

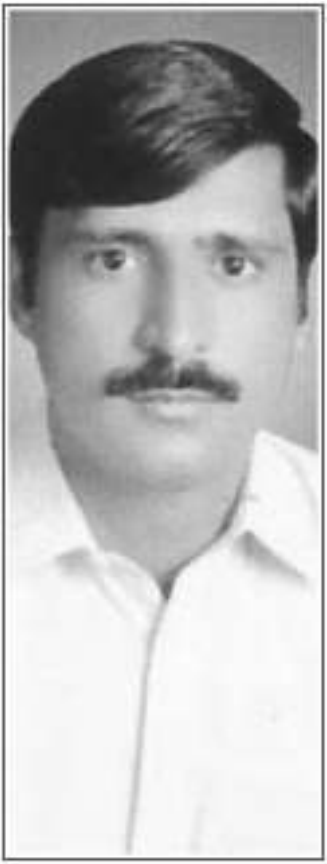

میں خوابِ نور سے بیدار ہو کے آیا ہوں
نبیؐ کے عشق سے سرشار ہو کے آیا ہوں

ہو انؐ کی محفلِ میلاد کا بیاں کیسے
میں گویا آپؐ کے دربار ہو کے آیا ہوں

حضورؐ! دامنِ رحمت میں ڈھانپ لیں مجھ کو
جہان والوں سے بیزار ہو کے آیا ہوں

خدا کا شکر ہے میں خاکدانِ ہستی پر
غلامِ سیدِ ابرار ہو کے آیا ہوں

یہ انؐ کی نعت کا اعجاز ہی تو ہے دانش
میں آج صاحبِ گفتار ہو کے آیا ہوں

اعجاز دانش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زر گل ہوئی مری گرد بھی کہ ریاض عشق رسول ہوں
بڑی پاک خاک ہے یہ گلی، میں اسی کی دھول کا پھول ہوں

نعتؐ

خدا کے فضل و رحمت کی لپک محسوس ہوتی ہے
حضوری کی جب آنکھوں میں چمک محسوس ہوتی ہے

میں خوشبو ان درودیوار کی یوں جذب کر لایا
یہاں آ کر بھی طیبہ کی مہک محسوس ہوتی ہے

نشانی یہ بھی ہوتی ہے شہِ طیبہ کے منگتوں کی
ہمیشہ ان کے لہجے میں کھنک محسوس ہوتی ہے

کسی بھی نعت کی تکمیل ہوتی ہے تو پھر مجھ کو
زمیں سے آسماں تک اک دھنک محسوس ہوتی ہے

کہیں لکھا ہوا اسم محمد دیکھ لیتا ہوں
تو پھر دل کے دھڑکنے کی دھمک محسوس ہوتی ہے

میں سرور شکر کرتا ہوں کہ جب یہ لوگ کہتے ہیں
ترے شعروں میں تائب کی جھلک محسوس ہوتی ہے

سرور حسین نقشبندی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک سرسری نگاہ میں گل رنگ ہو گئے
پست و بلند، دشت و جبل، ژاژ و بن تمام

نعتؐ

ذِکرِ محبوبِ خُدا لب پہ سجائے رکھنا
سبز گُنبد کو بھی آنکھوں میں چُھپائے رکھنا

جان ہی کیوں نہ چلی جائے، گِرانا نہ کبھی
پرچمِ اُلفتِ سرکار اُٹھائے رکھنا

رہنا شامل ہی غُلامانِ مُحمّد میں سدا
کوئی کُچھ بھی کہے، نِسبت ہی نبھائے رکھنا

خواہشِ خُلد اگر دِل میں تمھارے ہے تو پھر
خواہشِ دہر کو سِینے میں دبائے رکھنا

عشقِ سرکار کا رکھتے ہو اگر دعویٰ تُم
اپنے دامن کو گناہوں سے بچائے رکھنا

گُلشنِ دِل کو اگر رکھنا ہے تونے آباد
پُھول آقا کی محبت کے کِھلائے رکھنا

اُن کی ہر بات ہے باتوں کی پیمبر کیفی !
اُن سے اُلفت ہے تو پھر اپنی نہ رائے رکھنا

محمود کیفی

''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' [نعتیہ نظم]

جس کے لئے زمین دلیل، آسماں دلیل
جس کے لئے ہوئے ہیں یہ کون و مکاں دلیل
جس کے لئے ہیں بحر کی گہرائیاں دلیل
جس کے لئے پہاڑوں کی اونچائیاں دلیل
صحرا میں جس کے فیض کی زرخیزیاں دلیل
گلپوش پیڑ اور حسیں وادیاں دلیل
جس کی گواہ بحر کی سب بے کرانیاں
چشموں سے پھوٹتا ہوا آبِ رواں دلیل
یثرب تھا جو ، مدینۂ طیبہ کہا گیا
اُس بے مثال کے لئے ہے وہ مکاں دلیل
جس کی صداقتوں کے لئے وقف ہر یقیں
ہر اعتقاد جس کے لئے بے گماں دلیل
جس کی نوید سارے صحیفوں میں ہے رقم
جس کا ہے آپ مالکِ کون و مکاں دلیل
جس کے لئے نماز میں بھی ہیں شہادتیں
جس کے لئے نماز سے پہلے اذاں دلیل
اہلِ جنوں بھی جس کی حضوری میں ہوشیار
جس پر تمام حکمت و دانائیاں دلیل
جس کے لئے ہیں وقف سبھی نعت خوانیاں
جس کے لئے ہیں سب سخن آرائیاں دلیل
معراج کے سفر کا مِلا ہے شرف جسے
جس کے لئے چمکتی ہوئی کہکشاں دلیل
واقف ہیں سارے اہلِ نظر اِن رموز سے
کوئی عیاں دلیل ہے، کوئی نہاں دلیل

☆

کافی نہیں ہے تب بھی نسیمِ سحر ، اگر
دُہرائے لاکھوں مرتبہ میری زباں دلیل
لیکن تلاش کیوں کروں کوئی دلیل مَیں؟
اُس ذاتِ پاک کو ہے ضرورت کہاں دلیل

نسیمِ سحر

دُرِّ درود در کشا

سب سے عظیم تر دعا صل علی محمدِ
ان پہ درود بھیجنا صل علی محمدِ

صَلِّ عَلیٰ نَبِیِّنَا راہ میں ہے خرد جہاں
حیرتِ علم حق رسا صل علی محمدِ

آئینۂ ازل ہیں وہ، آئینۂ ابد بھی وہ
ان پہ نگاہِ کبریا صل علی محمدِ

دیکھا کسی نے کب کہیں؟ ایسا کوئی زمیں نشیں
جس پہ ہر آسماں فدا صل علی محمدِ

ان پہ درود بھیج کے عجز نے پائی آبرو
حِلم و ادب کا تد بڑھا صل علی محمدِ

عقل کی علم سے رہی بحث ہی بس درود پر
ذکر کا ہے کہ فکر کا صل علی محمدِ

ان پہ درود میں نہاں راز و خبر کے درمیاں
اور ہے اک مکالمہ صل علی محمدِ

کس میں ہے دم؟ کہ شمع پر سوختہ جانِ عشق سے
پوچھے درود یہ ہے کیا؟ صل علی محمدِ

ظن سے یقیں نے ہر پناہ ان پہ درود میں ہے لی
جذب و جنوں کی التجا صل علی محمدِ

ہیں سرِ دست اشک بس، دل کو یقیں کہ ہیں یہی
دُرِّ درود در کشا صل علی محمدِ

ہیں در رحمتِ علی ال محمدِ پہ سب
فیضِ مودت! اے خدا! صل علی محمدِ

آصف! ابھی جو نکہتیں تجھ کو درود سے ملیں
کیوں نہیں سب میں بانٹتا؟ صل علی محمدِ

مرزا آصف رسول

نعتؐ (نثری)

پروین سجل

پانو کے
باتمکنت تمثیلِ نقش
عقیدت کی رومالی میں لپٹے
رحلِ طاقِ جاں میں پڑے
اعتبارِ صحیفہ
رفیع المنزلت تعویذ ہیں
جنھیں
حرزِ جاں کی خاطر چوموں
گھر کی دہلیز چھوڑنے سے
پہلے.....
اور۔۔وردِ خاص کروں
بے شک..... پاک ہے وہ ذات
جس نے
وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ 0
ترجمہ: اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

(Masaoka Shiki)

Going out of the house
Ten paces,_____
And the vast autumn sea

چند ہی قدموں پر
گھر کے باہر پھیلا ہے
پت جھڑ کا ساگر

The bridge has fallen
down;
Behind the willow-tree
It is lonely

ٹوٹ گرا ہے پُل
بید مجنوں کے پیچھے
تنہائی بالکل

خاور اعجاز

The Soft breeze,
And in the green of a
thousand hills,
A single temple.

ہر سُو نرم ہَوا
لاتعداد پہاڑوں میں
اِک مندر تنہا

A travelling show;
The banner is wet
In the spring rain.

تم بھی دیکھو تو
بارش میں بھیگا بینر
چلتا پھرتا شو

The peacock,
Spreading out his tail
In the spring breeze.

پر پھیلائے مور
سرسبزی کے موسم کو
کر دے ہور دا ہور

23 مارچ کے حوالے سے [وطن کے لیے]

اے وطن! اے محبت بھری سر زمیں!
تیرے جیسا کوئی اور خطہ نہیں
تیری چوکھٹ پہ رکھی ہے ہم نے جبیں
اے وطن! اے محبت بھری سر زمیں!

میری سانسیں بندھی ہیں ہوا سے تری
تیری مسکان میرے لبوں کی ہنسی
تیرے دامن میں ہر شے، نہیں کچھ کمی
اے وطن! اے محبت بھری سر زمیں!

تیرے باغوں میں خوشبو کے انبار ہیں
تیری گلیوں میں رونق کے بازار ہیں
ناز کرتی ہے تجھ پر مری زندگی
اے وطن! اے محبت بھری سر زمیں!
اے وطن! اے محبت بھری سر زمیں!

اعجاز رضوی

چلتے چلتے

محمد ارشاد

''بیاض'' فروری میں بعض تحریریں ایسی ہیں جو کچھ کہنے پر آمادہ کیے دیتی ہیں۔ یہ خوش آیند ہے۔ رباعیات پر نظر پڑتی ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ اس صنف کی طرف توجہ کرنے والے شاذ ہیں۔ یوں بھی یہ ہر سخن ور کے بس کی بات نہیں کہ یہ مشکل ترین صنف سخن ہے باوصف اس کے کہ جملہ چوبیس اوزان میں کسی بھی ایک، دو، تین یا چار اوزان پر چاروں مصرعے کہے جاسکتے ہیں اس سہولت کے ہوتے ہوئے بھی رباعی کہنی آسان نہیں۔ یہ غزل نہیں ہر چند بصورت مختصر ترین غزل ہے لیکن بسیرت مختصر ترین نظم۔ غزل گو کو پہلے سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنے والا ہے لیکن رباعی گو کو اگر پہلے سے معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تو رباعی بسیرت بھی غزل بن جاتی ہے بصورت تو ہوتی ہی ہے۔ معاونین بیاض میں گاہے گاہے گلزار بخاری کی اور حالیہ شمارے میں خالد علیم کی رباعیات پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ خالد علیم کی آخری رباعی کا تیسرا مصرع 'معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا' ترجمہ ہے فارسی کی معروف رباعی کے چوتھے مصرع: 'معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد'' کا جسے انھوں نے نصیرالدین طوسی کی ملکیت بتایا ہے جبکہ یہی رباعی عمر خیام سے

بھی منسوب ہے:

ہر گز دلِ من ز علم محروم نہ شد
کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز
معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

....

بعض نسخوں میں تیسرا مصرع یوں بھی آیا ہے: اکنوں کہ ز روئے عقل در می نگرم

اسی مفہوم کی ایک رباعی نصیر الدین طوسی کی بھی ہے، جو اس کے علاوہ کسی سے منسوب نہیں جو کچھ اس طرح ہے:

آں قوم کہ راہ بیں فتادند شدند
.... خبر نہ دادند شدند

....

ایران کے سبھی اہلِ علم و فضل کا دعویٰ ہے کہ رباعی ایرانیوں کی صنفِ سخن ہے، شعرائے عرب کے کلام میں قبل از اسلام بھی اوزانِ رباعی پر اشعار نہیں ملتے۔ واقعی نہیں ملتے۔ حافظ محمود شیرانی بھی رباعی کو ایرانی زا صنف گمان کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ رباعی صنفِ شعر ہے ہی نہیں کہ اس کا ماخذ کلام شعرائے عرب میں تلاش کیا جائے۔ اس کا آہنگ زمینی نہیں آسمانی ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں اخرب و اخرم کے اوزان پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن شاعری نہیں جبکہ شاعری آہنگ قرآن کے مطابق ہو سکتی ہے۔ بعض نے رباعی کا بنیادی وزن جسے وزنِ مادر بھی کہا گیا ہے:

مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

ٹھہرایا ہے جو مطابق ہے سورہ الواقعہ کی اس آیت کے:

اِن کانَ مِنَ المُکَذِّبِینَ الضّالِّین

میں نے اپنی تحریر کردہ کتاب 'رباعی آغاز و ارتقا' میں متعدد آیات ایسی نقل کی ہیں حسن قطان کے تخریج کردہ اوزان اخرم و اخرب ان کے مطابق ہیں۔ یہ کتاب سید محمد کاظم اور جناب محمد سلیم الرحمٰن نے القا پبلی کیشنز لاہور سے چند سال پہلے چھپوائی ہے۔ یہ ان کی طرف سے عزت افزائی تھی ورنہ میں تو کبھی ان سے ملا تک نہیں ہوں۔

رباعیات کے بعد برخوردار سلیمان عبداللہ ڈار کی تحریر ہے (اگر صاحب تحریر کی تصویر میری تصویر کی طرح بیس سال پرانی نہیں تو انھیں برخوردار لکھنے پر معذرت کی ضرورت نہیں یوں بھی فارسی میں برخوردار اس کو کہتے جو اپنی روزی خود کما کر کھانے کے قابل ہو۔ معلوم نہیں میری تصویر محترم عمران منظور کو کہاں سے مل گئی جو چھاپ دی)۔ زیرِ نظر مضمون میں انھوں نے برٹرینڈ رسل کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے: ''وہ کہتا ہے کہ میں نے کائنات کے نظام کو بہت سٹڈی کیا کچھ باتوں کی سمجھ آئی مگر زیادہ باتوں کی ذہن تک رسائی نہ ہو سکی اس لیے (معاذ اللہ) میں ملحد ہوں۔'' ظاہر ہے کہ موصوف نے برٹرینڈ رسل کو ہرگز نہیں پڑھا، کسی اپنے جیسے کی تحریر پڑھی اور ایمان لے آئے۔ بی بی سی

کے ایک پروگرام میں رابرٹ فراسٹ نے برٹرینڈ رسل کے ساتھ گفتگو کی۔ مختلف نوعیت کے موضوعات پر سوالات میں ایک سوال رسل سے خدا کے بارے میں بھی تھا، جب کے جواب میں رسل نے کہا کہ میں یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ خدا نہیں ہے نہ یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ خدا ہے - آپ مجھے Skeptic کہہ سکتے ہیں۔ یہ گفتگو Bertrand Russell speaks his mind کے نام سے چھپ چکی ہے وہ نہ تو ملحد (atheist) تھا نہ لاادری (agnostic)۔ عجیب بات، ہے اگر

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

عمر خیام یا نصیر الدین طوسی کہے تو موحد اور غیر مسلم کہے تو ملحد۔ عطار یہ کہے:

صد راہ زہر ذرہ چو برمی خیزد
پس من چہ کنم کدام را ہے گیرم

تو عارف کامل۔ حافظ شیرازی یہی اعتراف ان الفاظ میں کرے:

در رہِ عشق نہ شد کس بیقیں محرم راز
ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

....

تو کئی صوفیا حافظ کی شرحیں لکھیں اور علما بھی اشرف علی تھانوی جن میں شامل اور مولانا رومی تو یونانی مجذوب فلسفی دیوجانس (Diogenest) کی طرح خدا تو خدا انسان کو بھی ڈھونڈنے کے تمنائی تھے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نہ شود آنم آرزو ست

....

یونان کا یہ شیخ ، دیوانہ بکارِ خویش ہشیار سردیوں کے دن تھے دھوپ تاپ رہا تھا سکندر اس کا شہرہ سن کر اس سے ملنے جا پہنچا اور اس رخ سے کھڑا ہوا کہ اس کا سایہ دیو جانس پر پڑ رہا تھا۔ سکندر نے عقیدتمندی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا آپ کو کچھ چاہیے ہو تو بتائیں حاضر کر دیا جائے گا۔ تو کہا مجھے یہی چاہیے کو میرے اور سورج کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔

کچی عمر میں بابا کہلوانے کے متمنی نے رسول اللہ کے یہ الفاظ بھی دھیان میں نہیں رکھے ماعرفناک حقّا حق مغرفتک ، اوروں کی انؐ کے سامنے حیثیت ہی کیا۔ موصوف کے نزدیک عقیدہ اور دانائی ہم معنی ہیں - ''بہت سے دانش ور عقیدے والے ہیں کچھ بے عقیدہ بھی ہیں بے عقیدہ بندے کے پاس دانائی کیسے آئے گی وہ تو ہے ہی بے یقینی کا شکار۔'' گویا موصوف عقیدے والے ہیں بے یقینی کا شکار نہیں پس ثابت ہوا کہ دانش ودانائی کے حامل ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ عقیدے والوں اور دانش ودانائی کے حاملین میں باہمی کشت وخون کیوں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کیوں ایک دوسرے کو گمراہ

کہتے ہیں نہ صرف مسلمان اور عیسائی (دونوں اہل عقیدہ) صلیبی جنگوں میں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے جن کے نتیجے میں کئی بچے یتیم، عورتیں بیوہ، دوشیزائیں لونڈیاں، جوان غلام، ماؤں کو معلوم نہیں کون بیٹا اور بیٹی کہاں کس کے پاس کس حال میں ہے نہ بہن کو بہنوں اور بھائیوں کی اور نہ بھائی کو بھائیوں اور بہنوں کی خبر۔ عیسائی آپس میں، مسلمان آپس میں، سنی شیعہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے یہی نہیں سنی آپس اور شیعہ آپس میں ایک دوسرے کو باہمی لڑائیوں میں قتل کرتے رہے۔ کیا عقائد و یقین و دانائی اور خبط Fanaticsm میں کوئی خط امتیاز کھینچا جاسکتا ہے۔ نیطشے نے کیا غلط کہا تھا کہ انسان حیوانات کی وہ واحد نوع ہے جو پاگل ہوئی ہے۔ انسانوں نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات ٹھہرا رکھا ہے۔ اگر مچھروں کی زبان ہماری سمجھ میں آتی تو یہی دعویٰ انھیں بھی کرتے سنتے۔ دلیل ان کے پاس بھی ہے کہ ہم بغیر کسی سہارے کے ہوا میں اڑ سکتے ہیں۔ پانی پر بیٹھ سکتے ہیں اسی طرح خشکی پر ''اشرف المخلوقات'' کا گرم اور میٹھا خون ہماری خوراک ہے۔ ہم ان کی جان تک لے سکتے ہیں اور لیتے رہتے ہیں۔ ہم انسانوں کی طرح پاگل نہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں۔ ہم بھی مختلف نسلوں پر مشتمل ہیں لیکن اک نسل دوسری نسل کو ختم کرنے کے درپے کبھی نہیں رہی۔

آج کل پاکستان میں کئی بابے کام کر رہے ہیں۔ ان میں کئی تعلیمی اداروں سے ڈگری ہولڈرز بھی ہیں۔ اتنا علم نہیں لیکن چرب زبانی اور طراقت لسانی کا ملکہ رکھتے ہیں اسی وصف کی بنا پر مریدوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ بھی رکھتے ہیں۔ ان میں کئیوں کو میں بھی جانتا ہوں جنھیں میں جانتا ہوں انھیں اور بہت سے لوگ بھی جانتے ہیں قارئین بیاض، میں سے شاید کئی۔ نام نہیں لے رہا۔ کسی کی روزی لگی ہوئی ہے تو لگی رہے۔ کسی سے یہ نہیں کہوں گا:

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر پائیں

.....

''بیاض'' کے اسی شمارے میں جناب نسیم سحر نے نعت کے بارے میں کسی کی تشویش رفع کرنی چاہی ہے۔ معلوم نہیں تشویش کنندہ کی تشویش رفع ہوئی کہ نہیں۔ عیسائیت میں تثلیث پر مشتمل خدا اور بندے کے درمیان پادری حائل ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں۔ عاجز بندہ اللہ اور اس کے رسول کی جناب میں کچھ بھی حد ادب میں رہتے کہہ سکتا ہے۔ مثنوی معنوی میں رومی نے ہم ایسے کج فہموں کی فہمائش کی خاطر ایک حکایت درج کی ہے: حضرت موسیٰ طور کی جانب جاتے ہوئے ایک گڈریے کے پاس سے گزرے اور اسے یہ کہتے ہوئے سنا۔

اے میرے خدا تو کہاں ہے یہاں آ میں اپنا کمبل بچھا کر تجھے اس پر بٹھاؤں، تیرے پاؤں میں چبھے کانٹے نکالوں اور اپنے گلے میں موجود سب سے پیاری بکری کا گرم تازہ اور میٹھا دودھ تجھے پلاؤں۔ حضرت موسیٰ یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے اور اسے خوب برا بھلا کہا۔ بیچارہ چپ ہو رہا۔ موسیٰؑ جب طور پر پہنچے تو اللہ نے سخت سرزنش کی اور کہا کہ تو نے یہ نہیں دیکھا کہ میرا بندہ جو کہہ رہا تھا کتنے صدق وخلوص سے کہہ رہا تھا:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

تیرا کام میرے بندوں کو میرے ساتھ جوڑنا ہے مجھ سے توڑنا نہیں:

از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اسی ذیل اور ضمن میں عربی کا ایک شعر مجھے یاد آ رہا ہے، بے محل ہوتا تو نہ لکھتا:

جاءت سلیمان یوم العرض قبرۃ تحمل جرادٍ فی فیھا
فترنمت بفصیح القول ان الھدایا علی المقدار مُہدیھا

....

دربار سلیمانؑ میں نذرانے پیش کیے جانے کے روز چنڈول بھی چونچ میں ٹڈی کی ٹانگ بطور نذرانہ لائی اور مترنم اور فصیح زبان میں کہنے لگی کہ ہر نذرانہ لانے والا اپنی مقدار (حیثیت) اور مقدور کے مطابق نذرانہ لاتا ہے۔

حمد ہو یا نعت کسی بھی معیار کی ہو، صدق درکار ہے، نیازمندی، سپردگی اور بے مائیگی کا اظہار ہے۔

صدق پیش آر کہ اخلاص بپے کرد سجود

....

"بیاض" کے اسی شمارے میں دو اور تحریریں بھی خواندنی ہیں ایک انور شعور کی شاعری کے اور دوسری پروین شاکر کی شاعری کے بارے میں۔ انور شعور کی شاعری صاف وشفاف بہتا پانی ہے اس میں وہی روانی ہے جو داغ کی شاعری میں ہے۔ اردو شعرا میں سے جتنی زیادتی ناقدین نے داغ کے ساتھ کی اتنی کسی کے ساتھ نہیں کی۔ داغ کا ہر مصرع برجستہ ہے۔ یہی خوبی انور شعور کی شاعری میں بھی موجود ہے:

مصرعہ برجستہ باید گو پس از ماہے رسد

....

انور شعور فارمولا شاعر نہیں۔ وہ مانگے تانگے کے مضامین رقم نہیں کرتا۔ اپنی شاعری میں جھوٹ نہیں بولتا، ہے اور چاہیے میں فرق روا رکھتا ہے۔ یہی خوبی پروین شاکر کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ وہ بھی جھوٹ نہیں بولتی جتنی اور جیسی ہے ویسی ہی اپنی شاعری میں بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس کے بعض شعروں میں، کم سہی، وہ برجستگی نہیں جو انور شعور کے اشعار میں ہے۔ وہ لاابالی ہے، پروین شاکر ایسی نہیں۔ انور شعور کا لاابالی ہونا پروین شاکر کا نہ ہونا شخصیت میں اختلاف کی وجہ سے ہے۔ شخصیت کی dimensions شاعری پر ضرور اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ انور شعور کی شاعری

بہجت افروز ہے اور پروین شاکر کی پُرتاثیر۔
دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

سب سے دلپذیر اور چشم کشا تحریر شاہ داستان کی حالیہ قسط ہے، جس میں وہی کچھ درج ہے جس کے عینی شاہد داستان سرا خود ہیں۔ انھوں نے صرف اپنے دور کے واقعات لکھے ہیں۔ ایسے ہی واقعات دوسروں نے بھی لکھے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہ سیاسی کھلاڑیوں کا مرجع بھی انتظامیہ کا رکن ہونے کی وجہ سے رہ چکے ہیں۔ ہمارے سیاسی رہنما علمی، ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے کس قسم کے لوگ چلے آرہے ہیں عبرت آموز داستان ہے۔ ان کے تکیے قائد اعظم کے زمانے سے سازشوں کے گڑھ چلے آرہے ہیں۔ ان لوگوں کو آم چاہئیں پیڑ گننے سے کوئی غرض نہیں، صرف آم چاہے آک کے پودے کے ساتھ لگے ہوں۔ شاہ داستان کی یہ قسط پڑھ کر پوری طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ منتخب ہونے والے کیسے منتخب ہوتے ہیں۔ کیا کیا جتن کرتے ہیں کیسے ایک دوسرے کے چرخے جلانے کے لیے انتظامیہ سے مدد کے طالب رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ انتخاب کا لفظ اردو میں election اور selection دونوں معنوں میں یکساں طور پر مستعمل ہے۔ الیکشن سلیکشن ہے اور سلیکشن ہی الیکشن بھی اور شروع سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ کسی کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو کسی دور میں پاکستانی سیاست میں جھرلو کے لفظ نے رواج پالیا تھا۔ یہ مداریوں کی اصطلاح تھی جو سیاست میں بھی در آئی تھی۔ مداری کوئی چیز کسی ایک جگہ چھپا دیتے پھر اس پر اپنی بانسری پھیرتے اور وہی چیز کسی اور جگہ سے نکل آتی۔ بانسری پھیرنے کو جھرلو پھیرنا کہتے۔ مجمع حیرت سے تالیاں بجاتا۔ پاکستان میں شروع سے انتخاب میں جھرلو پھرتے چلے آئے ہیں۔ ابتدا میں امیدواروں کو نشان الاٹ نہیں ہوتے تھے بیلٹ بکس بھی ہر امیدوار کو اپنا رکھوانا پڑتا جو عموماً لکڑی کا ہوتا اور اس پر کالا، نیلا، پیلا، سبز، سرخ رنگ اپنی مرضی کا کروالیتا۔ میرے زمانہ طالبعلمی میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان مسلم لیگی رہنما سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ووٹ گننے کے وقت پولیس بکس توڑ کر جسے جتوانے کا حکم ہوتا اس کے بکس میں ڈال دیتی۔ جس کو کوئی ووٹ نہ پڑا ہوتا تو بھی جیت جاتا۔ سرحد میں قیوم خان کا اور پنجاب میں ممتاز مسلم لیگی وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ کے جھرلو اخباروں کی زینت بنے۔

ضیاالحق کا ریفرنڈم اپنی مثال آپ تھا جو اس سوال پر تھا کہ اگر آپ (ووٹرز) اسلام کو مانتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ضیاالحق پانچ سال کے لیے آپ کا صدر ہوں۔ اسلام کا مطلب ضیاالحق اور ضیاالحق کا مطلب اسلام ٹھہرا۔ ضیاالحق = اسلام۔ اس

ریفرنڈم میں ایک پولنگ سٹیشن کا میں بھی پریزائیڈنگ آفیسر تھا۔ لوگ ووٹ ڈالنے کے لیے نہیں آ رہے تھے ۔ بی ڈی ممبر اور ریٹائرڈ فوجی سب پریشان تھے۔ بی ڈی ممبر نے لجاجت آمیز لہجے میں مجھے بتایا کہ مجھے کہا گیا ہے کہ جتنے ووٹ تم نے لیے ہیں اس سے کم ووٹ ضیاالحق کو نہیں پڑنے چاہئیں اب دو بج رہے ہیں کل تیس پینتیس ووٹ ہی پڑے ہیں ریٹائرڈ فوجی ووٹروں کو بھی اسی طرح کا حکم ملا تھا۔ اس ریفرنڈم میں پولنگ ایجنٹ جماعت اسلامی کے لوگ تھے۔ وہ بھی پریشان تھے۔ ضیاالحق کو مرد مومن مرد حق کا خطاب انھوں نے ہی دیا تھا۔ اس پریشان کن صورت حال کی اطلاع کسی نے ریٹرننگ آفیسر کو بھی کر دی۔ وہ آئے اور کہا آپ نے کیوں سب کو ناٹ کر رکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنی نوکری کی پروا نہیں تو دوسروں کی نوکری کا ہی خیال رکھیں۔ ریفرنڈم پورے ملک میں ہو رہا ہے صرف اس جگہ نہیں۔ ضیاالحق پچانوے چھیانوے فیصد ووٹوں سے جیت جائے گا کوئی ووٹ اس کے خلاف نہیں پڑے گا کہ کوئی مخالف امیدوار ہے ہی نہیں ۔ چار پانچ فیصد نہ پڑنے والے ووٹوں کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ ووٹر کسی بیماری یا کسی اور وجہ سے نہیں آ سکے۔ ریفرنڈم کا مقصد دنیا کو یہ باور کروانا ہے کہ ضیاالحق کی مقبولیت کسی بھی مغربی لیڈر سے زیادہ ہے۔ ریٹرننگ آفیسر کے مجھ پر احسانات بھی تھے اور بات درست بھی۔ عطاالحق قاسمی سے مستعار الفاظ میں دو بجے تک منصفانہ اور اس کے بعد آزادانہ ''انتخاب'' کی اجازت دے دی۔ لوگ تو پھر بھی نہیں آئے البتہ پولنگ ایجنٹ، بی ڈی ممبر، پنشنر صوبیدار میجر، جمعدار، عورتوں، مَردوں، مُردوں کے ووٹ بھی ڈالتے رہے۔ ریفرنڈم بروقت ختم ہو گیا۔ ضیاالحق کے ساتھ اسلام کا بھی بول بالا ہو گیا۔ اسلام کا بول بالا کرنے میں وہ لوگ سب سے آگے تھے جو 77ء کے الیکشن میں PNA والوں کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے اور جیل بھرو تحریک میں بھی شامل ہوئے۔ اس الیکشن میں بھی میں پریزائیڈنگ آفیسر تھا مجھے کسی نے نہیں کہا کہ کسے جیتوانا اور کسے ہروانا ہے حالانکہ امیدوار بھٹو کے شدید مخالف گوہر ایوب تھے، جو اس وقت جیل میں تھے۔ کوئی ایک ووٹ بھی کسی کو غلط نہیں پڑا۔ حالانکہ اپنے سیاسی مخالفین سے بھٹو کا رویہ مجھے سخت ناپسند تھا۔ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ولی خان کے جلسے کے شرکا پر گولیاں چلوائیں۔ قائد عوام کہلواتے تھے لیکن ان کے اندر وڈیرا پوری طرح بیدار رہا۔ البتہ ان کے دردناک انجام پر مجھے دکھ ضرور ہوا۔ جس دن انھیں پھانسی دی گئی اس دن شام کو میں بی بی سی کا پروگرام سیر بین سن رہا تھا۔ کسی صحافی نے ضیاالحق سے بھٹو کی پھانسی پر کمنٹس چاہے تو ضیاالحق نے جو کہا اس

میں سے یہی ایک فقرہ مجھے یاد رہ گیا ہے۔

The higher you fly the harder you fall

بھٹو کو پھانسی لگنے سے کچھ پہلے ضیاالحق کی یہ بات بھی مجھے یاد ہے کہ قبر ایک ہے اور اس میں کوئی ایک ہی دفن ہو سکتا ہے دو نہیں یعنی یا بھٹو یا میں دوسرے لفظوں میں وہ بچ گیا تو مجھے نہیں چھوڑے گا۔ بھٹو کی لاش کو ننگا کر کے اس کی تصویریں بھی بنوائی گئیں تا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ وہ مسلمان نہیں گھانسی رام تھا۔ اسلام کا اور بول بالا ہو جائے گا۔"

مجھے اللہ کی ہستی پر کبھی شک نہیں رہا۔ کہتے ہیں الایمانُ لا یزیدُ ولا ینقص، یعنی ایمان میں بیشی کمی نہیں ہوتی۔ یہ بات اپنی جگہ درست سہی لیکن اللہ پر میرے ایمان میں بیشی ضرور ہوئی خاص کر اس کی صمدیت اور بے نیازی پر ایمان میں۔ جس دن ضیاالحق کا جہاز بستی لال کمال کے نواح میں کریش ہوا تو ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ جہاز اوپر اُٹھا، سیدھا ہوا پھر اوپر اٹھا اور زمین پر آ رہا۔ فوراً ضیاالحق کا قول یاد آ گیا۔

The higher you fly the harder you fall

یہ بھی یاد آیا کہ بھٹو کا جنازہ بھی چند ایک آدمیوں کے سوا کسی کو نہیں پڑھنے دیا گیا۔ جب کچھ لوگوں نے فتویٰ دیا کہ اسلام میں غائبانہ نماز جنازہ ہوتا ہی نہیں، کیونکہ اکثر شہروں میں اس کے غائبانہ جنازے پڑھے جا رہے تھے۔ ضیا کا جنازہ بہت بڑا تھا لیکن جو تابوت آگے رکھا گیا تھا کیا اس میں ضیاالحق کی میت موجود تھی کیونکہ ٹی وی پر جو فلم اس حادثے کی چلائی گئی اس میں تو جہاز کے پرخچے آگ کی شدید حدت سے پگھل گئے تھے۔ کسی متنفس کے جل کر راکھ بننے کے سوا کچھ ممکن نہ رہا تھا۔ اور راکھ کو پہچاننا اور الگ کرنا محال ہے۔ اس کا جنازہ بھی تو غائبانہ ہی تھا۔ قبر میں ایک ہی گیا دوسرا نہیں۔ ضیاالحق کی یہ بات بھی سچ ثابت ہوئی۔ اس طرح کے عبرت انگیز اور عبرت آموز واقعات سے اللہ کی صمدیت اور بے نیازی پر ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں دوسروں کو اس سے زیادہ دے سکتے ہیں۔ ہر شخص کے اندر آدم اور ابلیس دونوں موجود ہیں۔ موسیٰ اور فرعون، ابراہیم اور نمرود کی کش مکش ہر کسی کے اندر موجود، لیکن ہر کوئی اس سے آگاہ نہیں۔ اکثر اوقات زُہد و تقشف اور خاص حلیہ و لباس اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکے میں رکھنے کا سبب بن جاتا ہے اور گفتگو بھی۔ مرزا بیدل نے داڑھی اتنی چھوٹی کر رکھی تھی کہ اس پر داڑھی کا الزام ہی لگایا جا سکتا تھا۔ کسی متدین نے اعتراض کیا تو جواب میں جو کہ مجھے صرف اتنا یاد ہے:

گر یک سرِ مُوست آدمیت کافی ست
چوں خرس ز سر تا بقدم ریش مباش

یعنی آدمیت بال کے سرے کے برابر بھی کافی ہے ریچھ کی طرح سراپا داڑھی بن جانا آدمیت نہیں۔

☆☆☆☆☆

الف دنسیم: عقیدۂ راسخہ کی غزل

محمد افتخار شفیع

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی اردو غزل محبت کے اس سرمدی رشتے سے منسلک ہے، جس کے فروغ میں ولی دکنیؒ، سراج اورنگ آبادیؒ اور میرزا مظہرؒ سے خواجہ میر دردؒ تک کے شعرا نے حصہ لیا۔ امیر مینائیؒ، بیدم شاہ وارثیؒ، فانی بدایونیؒ، امجد حیدر آبادیؒ، آسی غازی پوریؒ اور اصغر گونڈویؒ سے سید وجیہ السیما عرفانیؒ اور باباذہین شاہ تاجیؒ تک کے شعرا نے اس محبوبۂ دل براں صنفِ سخن میں حسن و عشق کے ازلی و ابدی تصورات کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا۔ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' والی بات ہمارے شعرا کی تصوف اور اس کے متعلقات کے ساتھ قلبی وابستگی کی غماز ہے۔ اپنے عہد کا رِند مشرب شاعر مرزا غالب بھی خود کو ولی سمجھتا ہے (ہائے! بادہ خواری)۔ تصوف ایک طرزِ زندگی ہی نہیں مقصدِ حیات بھی ہے۔ یہ انسانی قلوب واذہان کی تطہیر کر کے اصل معنوں میں انسان کو جملہ رذائل سے پاک کرتا ہے۔

ہماری غزل کے ان شعرا نے جو کسی سلسلے کے تربیت یافتہ تھے، اذہان وقلوب میں موجود بُرے خیالات کے منہ زور گھوڑے کو حدِ اعتدال پر لا کر شخصیت میں ایک توازن

قائم کرنے کی کوشش کی۔ دنیاوی جاہ و ثروت ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انھی موضوعات نے برصغیر کی فضاؤں میں مشترکہ تہذیب کی بنیاد رکھی تھی۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کے مطابق:

اردو شاعری میں تصوف کی روایت سب سے زیادہ وسیع اور گہری رہی ہے۔ اس نے اپنی اصطلاحی اور رمز و ایما کے پردے میں انسان دوستی، رواداری، خدمتِ خلق، وسیع المشربی، اخلاقی بلندی اور قلبی طہارت پر زور دیا ہے۔(۱)

آج کا انسان شعر کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے، اسے قناعت، توکل اور استغنا سے کوئی علاقہ نہیں۔ کچھ صوفیانہ اشغال بھی اس بدگمانی کا سبب بن گئے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق کے عروج کے زمانے میں ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے انسلاک کے باوجود انھوں نے شعوری طور پر ان دونوں تحریکوں سے الگ راستہ اختیار کیا۔ لاہور میں قیام کے دوران میں انھوں نے الگ سے ایک بزمِ ادب سجائی اور اس کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاسوں اور مشاعروں کا آغاز کیا۔ اس عمل کے پیچھے ان کے لاشعور میں موجود ان سماجی قدروں کے تحفظ کا جذبہ شامل رہا ہو گا جو صدیوں سے موجود ہیں، ہماری کلاسیکی غزل کی بنیادیں بھی اسی روایت پر استوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اپنی ذات میں گم ہو کر الگ سے راستہ بنانے کی کوشش عین فطری دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی اسی سلسلے کے فرد فرید ہیں۔ ان کی غزل میں صوفیانہ رجحانات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ ایک اور چیز انھیں اس سلسلے کے شعرا سے منفرد بھی کرتی ہے جسے ہم اقبالؒ کی الوہی اَنا کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ تصوف کی ایک لطیف روایت کے ساتھ ان کی شاعری میں اقبالؒ کی فکری حرکیات کی ایک طاقت ور لہر بھی تیرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ طریقت کا وہ راستہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے قول (ہر کہ مخالف شریعت است مردود است) کی فکری اتباع کرتا ہے۔ یہ فکر خانقاہوں سے نکل کر رسم شبیری ادا کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ انھوں نے جس دور میں جوان ہو کر بھرپور زندگی کا آغاز کیا، اقوام عالم دو بڑی جنگوں میں لگے زخم چاٹ رہی تھیں۔ صنعتی دور کے زیرِ اثر پاک و ہند میں بھی عقل پرستی کا چلن عام تھا۔ الف۔ د۔ نسیم نے مذہب اور سے وابستہ اقدار کا دفاع اپنے ذمے لیا۔ وہ صدیوں پرانی اس روایت کی حفاظت میں لگ گئے جو اپنوں کے ہاتھوں پامال ہونے کے قریب تھی۔ اس موقع پر ان کا جذباتی ہونا عین فطری ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے ایک مضمون میں تفصیل کے ساتھ

نسیم صاحب کے اس دور کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے۔ کہتے ہیں: ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے جس زمانے میں شعور کی آنکھ کھولی وہ متحدہ ہندوستان کی غلامی کا زمانہ تھا۔ فرنگی سیاست زوروں پر تھی۔ مسلمان زوال آشنا تھے۔ مادی اور تکنیکی ترقی نے روحانی شمعوں کو سرد کر رکھا تھا۔ علت و معلول کی منطقی دست برد سے بچنا کارمحال تھا۔ دنیاوی عقل کے معاملات کو پذیرائی مل رہی تھی۔ ایمان اور عشق کے حوالے اہمیت کھو چکے تھے۔ آتش نمرود میں عشق کے کود جانے کے وقوعات کو پارینہ قصے گردانا جا رہا تھا۔ تشکیکی منطق زوروں پر تھی۔ سرسید کے تتبع میں عقلیت پسندی کے راستے کو بنیادی اہمیت دی جا رہی تھی۔ نئے سائنسی علوم کے رسیا اذہان ہر چیز کو تجربے کی کسوٹی پر پورا اتارنا چاہ رہے تھے۔ ایسے میں اس امر کی اشد ضرورت تھی کہ عقلی اور فکری دلائل اور سائنسی شعور کی روشنی میں ایمان اور عقائد کے سلاسل کی توجیہات کا رستہ اپنایا جائے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے نئے زمانے کے تناظر میں قدیم مذہبی عقائد کی تشریح و تعبیر کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ہرمینیوٹک کے جدید تصورات کے حوالے سے مذہبی متون اور شعری دانش کی عصری شرحوں سے سروکار رکھا (۲)

صوفیا کے نزدیک تصوف ایک کل ہے، اور اس کے اہم اجزا میں قرب خداوندی، فقر و غنا، حسن و عشق، فنا و بقا، تسلیم و رضا، انسان دوستی اور جبر و قدر وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر نسیم صاحب صوفیانہ محافل کے تربیت یافتہ تھے۔ کم و بیش اردو غزل کے یہی عناصر ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے شعری تصورات کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں موجود سادگی، استغنا اور بے نیازی نے انھیں ایک خاص ماحول فراہم کیا، ان کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جلوۂ یار عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ہر جگہ اُس کا نشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کعبہ و دیر میں بے کار کیا اُس کو تلاش
وہ مری روح و رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
تمام عمر ملا پھر نہ اپنے گھر کا پتا
بتا گیا تھا کوئی مجھ کو اپنے در کا پتا
جہاں کہیں ہے کف پائے یار کی تصویر
وہاں سے لانا تو اے شیخ میرے سر کا پتا

شاعری انسانی متخیلہ کی معراج ہے، مذاہب و عقائد میں عبادات سے متعلقہ اظہار کے زیادہ تر طریقے بھی شاعری کی طرح جذبہ و خیال کے پابند ہیں۔ اظہار کی بلند ترین سطح پر مذہب، فلسفہ اور شاعری کا منتہائے مقصود ایک ہو جاتا ہے۔ شعر کی بنیادی چیز اگر جذبہ ہے تو مذہب کے پرستار کے ہاں اس کے خارجی اظہار کی ایک صورت بُت

تراشی بھی ہے۔ اُردو شاعری کا پس منظری ماحول مذہبی ہے، اس کا تلمیحاتی اور تشبیہاتی نظام خالص عربی اور ایرانی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم شاعری اور مذہب کے باہمی تعلق کے نہ صرف قائل ہیں بل کہ اسے دلائل و براہین سے ثابت بھی کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''مذہب اور شاعری: چند تمہیدی مباحث میں کہتے ہیں:

مذہب اور اخلاقیات بھی آرٹ کی طرح واقعات اور اشیا کی ترجمانی ایسی طرز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ہم میں بھی ایک ہیجانی اور جذباتی کیفیت پیدا تا کہ ہم ان کے مسلمات کے آگے بلا تامل سر تسلیم خم کریں۔ مذہب جس کا مقصد ایک مکرر نظام کے تحت خدا یا اپنے سے برتر کسی اور ہستی کا ذہنی یا وجدانی ادراک ہے، شاعری کی طرح یہ ایک حد تک جذبہ یا تخیل کا محتاج ہے۔ ایک آدمی جب مذہب کے دیگر فرائض حقوق سے الگ صرف خدا یا اس کے کسی اور مظہر (جسے وہ خدا سمجھتا ہے) کی ذات وصفات کے ادراک کی کوشش کرتا ہے تو لازمی طور پر اسے اپنی قوت متخیلہ سے کام لینا پڑتا ہے اور جب وہ اپنے خیال میں اس ہستی کا کوئی نہ کوئی نقش قائم کر لیتا ہے تو اس کے جذبات میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار وہ مناجات، دعا اور عبادت کے ذریعے کرتا ہے۔(۳)

اردو شاعری کے اس متصوفانہ مزاج کے مختلف سلاسل کے زیر اثر فرد، سماج اور ادب خاص طور پر اُردو غزل پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہماری غزل میں وحدانیت، مشاہدہ، رواداری، عشق، معرفت، توحید، نظریہ وحدۃ الوجود، سخاوت، دنیا کی بے ثباتی، صبر و رضا، سیاحت، خرقہ پوشی، فقر، شریعت، طریقت، ریاضت، عبادت، ذکر، ہدایت، سماع اور انکسار جیسے موضوعات اسی کے تابع ہیں۔ تصوف کی دنیا میں محبوب کی وسعت آفاق پہ چھائی ہوئی آنکھیں دراصل چشم دل وا ہونے کی علامت ہیں۔ مست آنکھوں کا شراب خانہ طالب و مطلوب کے درمیان ایک الگ رشتہ قائم کرتا ہے۔ اس کی موجودگی میں کسی اور نشے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چشم محبوب عقدہ کشا ہے، بے قرار دلوں کے قرار کا باعث ہے:

می حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باقیست

.....

ڈاکٹر نسیم صاحب کی غزل میں حسن و جمال کی علامات کا یہی دل پزیر عنصر موجود ہے:

کس کافر نے کہوں دیے ہیں مست آنکھوں کے مے خانے
ذرہ ذرہ جھوم اٹھا اور رقص میں آ گئے دیوانے

جس کی یاد میں آنکھوں سے اک خون کا دریا بہتا ہے
ایک وہی بے درد ہمارے دل کا حال نہ پہچانے

دل سے اتر کے پار جگر سے نکل گئی
تیغ نگاہ بھی کیا چال چل گئی

ہوا تھا دل میں جو پہلے ہی وار میں پیوست
ملا نہ پھر کبھی اس ناوک نظر کا پتا

پہلی نظر میں ہم نے تو سب کچھ لٹا دیا
بے زار جیسے بیٹھے تھے پہلے ہی جی سے ہم

گلشن میں ترا طالب دیدار ہوا تھا
اس بات پہ گل رہتا ہے خاروں میں نظر بند

جو چہ نداروں میں ضو فگن ہے جو پھول کلیوں میں جلوہ گر ہے
نگاہ مستی سے کوئی دیکھے تو تیرا ہی ہے جمال ساقی

.....

چشم دل حسن ازل کا مشاہدہ کرتی ہے، یہ بصارتِ ازلیہ کی جانب اشارہ کرتی ہے، اگر خاص زاویے سے پڑے تو چہرے پر دائمی عشق کے نقش ونگار بنادے، جمال خداوندی تک رسائی دے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جس طرح ابرو کو آنکھ کی ہم راہی بالکل اسی طرح میسر ہے جیسے ذات حق اور قاب قوسین کا تعلق ہے۔ ابروؤں کا ایک اشارہ ہی حل المشکلات ہے:

یہ ہوش کس کو ہے مے کو دیکھے حرام ہے یا حلال ساقی
تمہارے ابرو کا ہو اشارہ میں نہ پیوں کیا مجال ساقی

.....

زلف، کاکل اور گیسو کی صوفیانہ اصطلاح بھی طالب ومطلوب کے درمیان ایک عجیب رشتے کی نشان دہی کرتی ہے۔ یوں تو یہ جدا جدا ہیں۔ بہ قول ابراہیم ذوق:

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

.....

زلف کی خوشبو محبوب تک رسائی کی علامت ہے، یہ اگر چہرے کو چھپالے تو انقباض کی کیفیات جنم لیتی ہیں، جیسے چاند بادلوں کی اوٹ میں آجائے تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ چہرے اور زلف ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

تیری زُلفوں کی لٹک آج بھی ہے یاد مجھے
منہ کے غنچے کی چٹک آج بھی ہے یاد مجھے

انجم کی ضو، قمر کی ضیا، مہر کی شعاع
نور رخ سحر ہے، ذرا دیکھو تو سہی

ہیں جلوۂ محبوب میں خورشید و قمر بند
زلفوں میں اگر شب ہے تو ہے رخ میں سحر بند

بزم میں ساقی گلفام کی وہ تھا مژگاں
رزم میں نوک سناں تھا مجھے معلوم نہ تھا

.....

ڈاکٹر صاحب کی شعری کائنات نعت شریف، غزل، رباعیات اور منقبت پر مشتمل ہے، انھوں نے دنیاوی فائدے کے لیے کبھی کسی صاحب ثروت وجاہ کا قصیدہ نہیں لکھا، ان کے فکری وروحانی مرشد خواجہ میر درد" کہتے ہیں "فقیر کے اشعار باوجود رتبہ شاعری اور نتیجہ شاعری کے نتائج

نہیں ہیں۔ فقیر نے کبھی شعر آورد سے موزوں نہیں کیا اور نہ کبھی اس میں مستغرق ہوا۔ کبھی کسی کی مدح نہیں کی نہ ہجو لکھی اور فرمائش سے شعر نہیں کہا" (۴)۔ عملی طور پر نسیم (مرحوم) کے قلم نے بھی یا تو بابرکت ہستیوں کی مدحت لکھی یا قوم کو علم و عمل کے راستے پر لانے کی سچی جستجو کی۔ انھوں نے اپنے اشعار میں قوم کو خود آگاہی اور ذات کے عرفان کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔ انہوں نے خود بھی با مقصد زندگی گزاری اور دوسرں کو بھی اس پر آمادہ کیا۔ وہ تصوف کے اس راستے کے سالک تھے جس میں دنیا کے سارے معاملات رنگ نبویؐ میں رو پذیر ہوتے ہیں:

ہر شے میں جب صفات خدا کا ظہور ہے
ہر شے خدا نما نہ کہوں تو کیا کہوں
ہر سو وہ جلوہ گر ہے ذرا دیکھو تو سہی
وہ دعوت نظر ہے ذرا دیکھو تو سہی
کہتے ہیں شاہ رگ سے بھی ہے وہ قریب تر
نزدیک کس قدر ہے ذرا دیکھو تو سہی
میری وفا نے عمر بھر ان کا دیا ہے ساتھ
ان کی وفا تو ساتھ میرے پل کے پل گئی
رندوں نے لے لیا اسے نوک زبان پر
ساقی کے ہاتھ سے جو صراحی پھسل گئی
اس نقش پائے ناز پہ رکھا ہے جب سے سر
کیفیت سجود کی صورت بدل گئی
کہیں تصویرِ بتاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
کہیں ناقوس کے سینے میں تھا فریاد کناں
کہیں آواز اذاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
تھا کہیں سلسلہ کوہ و جبل میں ساکت
کہیں دریائے رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
خندۂ گل تھا کہیں اور کہیں موجِ نسیم
کہیں بلبل کی فغاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

مسائل تصوف میں بت خانہ، مے کدہ، دیر و حرم، شراب، پیر مغاں، ساقی، زنار، ساغر، صراحی اور پیمانہ وغیرہ مختلف مقامات ہیں۔ دل بر، یار، صنم، دوست اور محبوب وغیرہ معبود حقیقی کی تجلی صفاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس روایت کے خوب شناسا تھے۔ انہوں نے صوفیانہ مصطلحات پر ایک شان دار کتاب بھی لکھی ہے۔ صابری نور مصطفیٰ کے خیال میں:

ان (نسیم صاحب) کی غزل کا امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ ہمیں فکر اور احساس کی ہم آہنگی کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے احساسات میں ایسی شدت یا طغیانی کا تاثر نہیں ملتا کہ فکر کو بہا دے اور فکری سطح اوجھل کر دے اور نہ ہی فکر و خیال اتنے مجرد ہوتے ہیں کہ احساس کا تاثر ہی ختم ہو جائے۔ فکر اور احساس کا اس حسین امتزاج نے انھیں منفرد غزل گو کی صف میں شامل کر دیا۔ ایسا طرز عمل ہمیں بہت کم شاعروں کے

ہاں ملتا ہے۔ جہاں فکر اور احساسات کی ہم آہنگی مل کر غزل کی دل کشی، لطافت، رنگینی اور پر کیف مناظر میں اضافہ کر دے ۔ (۵)

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ہاں اسی نوع کی غزلیں ملتی ہیں جن میں ایک خاص قسم کی فضا ہے، چند نمونے یہ ہیں:

ہے آمدِ فصلِ گل و لالہ کی بہت دھوم
ظالم مجھے اب کے تو نہ زنجیر میں کر بند
کچھ لطفِ چمن ہم کو بھی لے لینے دے صیاد
اڑتے ہی نہ کر طاقتِ پرواز کو پر بند
شاید ہے بہاراں میں مے ناب کی تاثیر
غنچوں نے جو مستی میں دیے کھول کمر بند
اے موجِ نسیم سحری، مردہ زمیں سے
شاخوں پہ نکل آئے ہیں کتنوں کے جگر بند
جو پہنچے گرد کو اس کی خرد کی کیا ہے مجال
مقام عشق ہے بیروں زِ حدِّ وہم و خیال
وجود بحر پہ موقوف ہے حباب کی زیست
جو تو نہیں تو مری زندگی، عدم کی مثال
مقامِ سدرہ و طوبیٰ جہانِ ذات و صفات
ہے سارا عشق کا حاصل، ہے سب اسی کا مال
کمالِ آدمِ خاکی ہے ذات کا دیدار
مگر نصیب نہیں جز بہ ذوق و مستی و حال
نقوشِ دہر میں بھرتی ہے رنگ ہر لحہ
مری نگاہِ تماشا برنگِ ذوقِ جمال
خدا سے مانگ، دلِ زندہ، دیدۂ بینا
حذر زِ دانش حاضر کہ ہے خودی کا زوال
درونِ میکدہ اُس کا گذر نہیں لیکن
نسیم راہ نشیں بھی ہے کوئی صاحب حال
جوابِ خط کی تمنا رہی ہے اب کس کو
کوئی بتائے مجھے میرے نامہ بر کا پتا
خزاں کا دور بھی کتنا مقام عبرت ہے
نہ عندلیب کا ہے اور نہ برگ تر کا پتا
ہوا تھا فصلِ بہاری میں جو اسیرِ قفس
نسیم، لا تو کبھی اس شکستہ پر کا پتا

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ہاں اہم شعرا کے لب و لہجے کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے خواجہ میر درد، میرزا اسداللہ خاں غالب اور علامہ محمد اقبال کی غزل کے رموز و علائم کے اچھے خاصے اثرات قبول کیے ہیں۔ ان کے شعروں کی لفاظی اور پیش کش بہ ذات خود اس کا اعتراف کرتی ہے۔ ان کی غزل میں اقبال کے فکر و فلسفہ کی گہری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

حقیقت جذب و مستی کیا ہے؟ یہ اہل ہوش و خرد نہ جانیں
بساط عالم الٹ کے رکھ دے، جو رند ہو باکمال ساقی
مقام سدرہ و طوبیٰ جہاں ذات و صفات
ہے سارا عشق کا حاصل ہے سب اسی کا مال
کاروان عشق میں اب ایک بھی مجنوں نہیں
اور لیلیٰ بھی ہوس کے جام سے مدہوش ہے
میری زندگی کا حاصل میرا فقر کج کلاہی
نہ پسند آیا مجھ کو کبھی تاج و تخت شاہی

کہیں لامکاں سے آگے ہے نظر میرے جنوں کی
ہے غبار راہ منزل یہ جہان مرغ و ماہی
کسی مرد سے سبق پڑھ من عرف نفسہ کا
تو ہی کھیت تو ہی پانی تو ہی فصل تو ہی دانہ
جو زمیں میں مسجد تھی اب تہذیب کا میخانہ ہے
مشرق و مغرب میں ہر جا شور نا ؤ نوش ہے

.....

علامہ اقبال کی طرح ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے ہاں بھی عشق ایک متحرک قوت ہے جو کہیں روح الامین کا ہم راز ہے، کہیں اس کی پرواز طائر سدرہ سے بھی بلند ہے، عشق کے جملہ تصورات عام طور پر علامہ اقبال سے ماخوذ ہیں، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی غزل میں اردو کی صوفیانہ روایت کی پیروی کے ساتھ ساتھ اقبال کا تصور عشق بھی نمایاں ہے:

عشق ہے مطرب ازل کا ساز
عشق روح الامین کا ہمراز
سدرۃ المنتہیٰ سے بھی ہے پرے
بے خبر مرغ عشق کی پرواز
عشق سے آدمی کی خاک میں نور
عشق سے سنگ ، سنگ کوہ طور
ماہ و انجم میں بھی ہے ظہور اس کا
ذرے ذرے سے عشق ہے مستور
خانۂ عشق قلب انسانی
منبع عشق ذات نورانی
بازی عشق جنگ بدر و حنین
شوکت عشق فقر سلمانی

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی غزل اردو کی کلاسیکی فضا میں آنکھ کھولتی ہے۔ یہ شاعری روایت کا تسلسل ہے، یہ ایک عارف کے مجذوبانہ مضامین ہیں ، ایک صوفی کے افکار و تصورات ہیں، یہی اس غزل کی اہمیت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، ''اردو شاعری میں تصوف کی روایت''، مشمولہ مقالات تنقید و تحقیق''، علی گڈھ، ادارۂ تالیفات اردو، ۱۹۵۶ء، ص ۱۵۴
۲۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، دیباچہ ''ارکان اسلام: فکر اقبال کی روشنی میں''، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم، ص ۶
۳۔ الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر، ''مذہب اور شاعری''، مشمولہ ''نئی شاعری''، شمارہ :اول، اگست ۲۰۱۶ء۔ مدیر ڈاکٹر سعادت سعید، لاہور، ص ۳۴
۴۔ عبداللہ قریشی، محمد، ''علم الکتاب: ایک مطالعہ'' ماہ نامہ ''صریر''، شمارہ ۱، سالنامہ ۱۹۹۳ء۔ مدیر ڈاکٹر فہیم اعظمی، کراچی
۵۔ صابری نور مصطفیٰ، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کی علمی و تحقیقی خدمات: مشرقی اقدار کی روشنی میں''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۴۴

☆☆☆☆☆

اظہارِ ذات کی شاعرہ... صائمہ اسحاق

یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر اپنے مطالعے کی بنیاد پر اپنے شعری سفر کو آگے بڑھاتا ہے۔ اِس سفر میں اُسے جو تلخ و شیریں تجربات اور عمیق مشاہدات ہوتے ہیں وہ انھیں اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے۔ یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ کس فن کاری، چابک دستی اور ہنرمندی سے کارِ شاعری کو سرانجام دیتا ہے۔

صائمہ اسحاق ایک وسیع المطالعہ شخصیت ہیں۔ ہر شاعر اپنے مستند پیش رووں سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اسلاف شعرا کی شاعرانہ خوبیاں اور اوصافِ شعری اس کے ذہن میں راسخ ہو کر لاشعور میں چلے جاتے ہیں اور جب کوئی شاعر تخلیقاتِ شعر کے مراحل سے گزرتا ہے تو لاشعور میں موجود تصورات اور نازک احساسات خیالی تصویروں کی صورت اُس کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ صائمہ اسحاق نے ایک طویل عرصے تک میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبال، رفیع سودا، ابراہیم ذوق، مومن خان مومن، انشااللہ خان انشا، مصحفی، داغ دہلوی، آتش اور جرأت کو پڑھا ہے، یہی وجہ ہے کہ صائمہ اسحاق جان گئی ہیں کہ کلاسیک شاعری کیا ہوتی ہے، وہ مطالعے کی مدد سے کلاسیک کی روح تک سے واقف ہوگئی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اُردو ادبِ عالیہ ان کے مزاجِ شاعرانہ میں سرایت کر گیا ہے۔ امیر مینائی، جلیل مانک پوری، بیخود دہلوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، سیماب اکبرآبادی، شاد عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی، فانی بدایونی کے عمیق مطالعے سے شاعرہ موصوفہ نے فکری سطح پر کسبِ فیض بھی کیا ہے اور ان کی شاعرانہ خوبیوں کی روشنی میں اپنی شاعری کو نکھارا بھی ہے۔

حمایت علی شاعر، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھ

شاعر علی شاعر

پوری، احسان دانش، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، مجاز لکھنوی، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، میرا جی، ن م راشد، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، محشر بدایونی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، قابل اجمیری اور شکیب جلالی کی غزلوں، نظموں میں الفاظ کی بنت اور خیالات کی آمیزش کو بھی اُنہوں نے ذہن نشین کرلیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں ندرتِ خیال، تخیل کی بلند پروازی اور بنت کے لحاظ سے قابلِ تعریف نظر آتی ہیں۔

متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے اپنے عہد کے شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ جن میں ظفر اقبال، صابر ظفر، سلیم کوثر، شبنم رومانی، محب عارفی، رئیس فروغ، رضی اختر شوق، صہبا اختر، جمال احسانی، لیاقت علی عاصم وغیرہ اور شاعرات میں پروین شاکر، ادا جعفری، زہرا نگاہ، شبنم شکیل، یاسمین حمید، ڈاکٹر شاہین مفتی اور حمیرا رحمٰن وغیرہ شامل ہیں۔ شاعرات کے کلام کے مطالعے سے اُن کے یہاں نسوانیت کے اظہار کا سلیقہ آگیا ہے۔ وہ جرأت مندانہ انداز میں عورت کے اندر جنم لینے والی خواہشات کا اظہار کرتی ہیں۔ صائمہ اسحاق ان شاعرات میں سے نہیں ہیں جو اپنے ارمان مار کر بیٹھ جاتی ہیں، اپنی خواہشات کا خون کردیتی ہیں، اپنی حسرتوں کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اُٹھالیتی ہیں بلکہ وہ اُن شاعرات میں سے ہیں جو پروین شاکر کی طرح اپنے احساسات کا برملا اظہار کردیتی ہیں۔ ادا جعفری کی طرح ہر بات کو مؤدبانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی لیے میں نے صائمہ اسحاق کو اظہار ذات کی شاعرہ قرار دیا ہے۔ وہ اپنی ذات کا برملا اظہار کردیتی ہیں، اس سے مراد ہم شاعری میں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر اُنہوں نے کہا:

ہمارے رُخ پہ جو رنگِ جمال ٹھہرا ہے
کسی کے حسنِ نظر کا کمال ٹھہرا ہے

.....

تو اِس کا مطلب اجتماعی طور پر یہ ہوگا کہ ہر محبوب یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہمارے چہرے پر جو تروتازگی، رونق، دل کشی اور حسن و جمال ہے یہ ہمارے منظورِ نظر کا کمال ہے کہ اس کی نظر ہم پر ٹھہری تو رنگِ جمال آیا۔ جیسے گلشن میں بہار آتی ہے تو پھولوں پر جوبن اور کلیوں پر نکھار آجاتا ہے۔ محبوب کا نظر بھر کر دیکھنا بھی گلزارِ رخسار پر بہار کی مانند ہوتا ہے۔

صائمہ اسحاق اُسلوبِ تازہ کی شاعرہ ہیں، اُن کے اشعار میں زبان و بیان کے مرحلے سلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات، احساسات اور فکر و مشاہدات کو منظوم کرنے پر دست رس رکھتی ہیں۔ اُن کی شاعری شعری آہنگ بھی لیے ہوئے ہے اور غنائیت و ترنم کا لبادہ بھی زیبِ تن کیے ہوئے ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مشاورت سے تری بام و در سنورتے تھے
جو تو نہیں ہے تو سارا مکان میلا ہے

☆

اِک اِسی بات پہ پھولے نہ سمائے ہم بھی
شکر صد شکر تمہیں یاد تو آئے ہم بھی

☆

جیت بھی ہماری ہے ہار بھی ہماری ہے
اب کی بار ہم نے بھی ایسا کھیل کھیلا ہے

.....

ہر عقل مند مسافر، سفر اختیار کرنے سے پہلے زادِ سفر تیار کرتا ہے، اپنی منزل کا تعین کر کے سمت و راہ لیتا ہے اور پھر سفر اختیار کرتا ہے۔ جلد باز اور عجلت پسند مسافر ایک طویل مدت تک دشوار گزار راستوں سے گزر کر جب منزل مقصود پر پہنچتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ یہ منزل تو ہماری منزل نہیں ہے ہمیں تو کہیں اور جانا تھا۔ سارا سفر بے کار ہو جاتا ہے۔

صائمہ اسحاق نے اپنے مزاج سے ہم آہنگ شاعری کی راہ متعین کی ہے اور وہ بالکل درست سمت میں سفر کر رہی ہیں۔ اُن کے دو شعری مجموعے، ''حاصل'' اور ''رخت'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں جن میں غزلیں اور نظمیں ہیں جو تازہ کاری سے پُر ہیں۔ ان کی نظمیں بھی جان دار ہیں مگر میرے خیال میں اُن کا غزل پر ہی تمام تر توجہ مرکوز رکھنا بہتر ہوگا کہ غزل میں اُن کا لہجہ اُن کی ہم عصر شاعرات سے ہٹ کر ہے۔ جس طرح ہم اگر کسی پینٹنگ کی نمائش میں جاتے ہیں تو ہر تصویر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہم اُنہیں بہ غور دیکھتے ہیں اور کبھی تو اُن کے رنگوں میں کھو جاتے ہیں اور کبھی اُن کے آرٹ میں، کچھ تصویریں ہمیں اپنا گرویدہ کر لیتی ہیں اور ہم فن کار کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اِسی طرح صائمہ اسحاق کی شاعری پڑھتے ہیں تو وہاں مختلف غزلیں ہمارا دامنِ نظر اپنی طرف کھینچی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

کسی میں خیال کی ندرت، کسی میں تخیل کی بلند پروازی، کسی میں اچھوتا خیال اور کسی میں الفاظ و محاورات کا استعمال چونکا دیتا ہے۔ صائمہ اسحاق کے دونوں شعری مجموعوں میں شامل غزلیات اس بات کی گواہ ہیں کہ شاعرہ موصوفہ نے اِنہیں تازہ کاری، مسحور کن آب و ہوا اور دیدہ زیب رنگوں سے سجا کر اور قطع و برید کے بعد سنوار کر پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے خیالات کو نیا پہناوا بھی عطا کیا ہے اور اُن میں تازہ کاری کی روح بھی پھونکی ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کو اُسلوب کی جدت سے بھی آراستہ کیا ہے اور فکر و خیال کی گہرائی اور گیرائی سے بھی ہم کنار کیا ہے۔ ان کی شاعری Statement نہیں ہے، اکثر اُنہوں نے علامت و تجرید کا سہارا لیا ہے مگر زبان کی شائستگی اور لہجے کی شگفتگی کا ہاتھ کسی موڑ پر نہیں چھوڑا۔ اُنہوں نے اپنے ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے اور حال کے مشاہدات کو بھی اشعار میں سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حال اپنی

تمام تر رعنائیوں اور شعری تقاضوں کے ساتھ اُن کے کلام میں موجود ہے۔ اِس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پُل کی تعمیر ضروری ہے ہمارے مابین
تو بھی چاہے تو مرا ہاتھ بٹا لے آ کر

☆

یہ کڑا وقت ملا دیتا ہے مٹی میں اَنا
کیسے کیسے سے مدد مانگنی پڑ جاتی ہے

☆

وہ شجر جس نے نمو پائی تھی دل کے اندر

بانجھ رُت سہہ کے ثمر بار ہوا ہے مجھ میں

صائمہ اسحاق نے ابھی سخن کا سفر اختیار کیا ہے۔ ابھی اُنہیں دشوار گزار راستوں سے بھی گزرنا ہے، سرد و گرم سے آشنا ہونا ہے۔ پُر پیچ راہوں پر چلنا ہے۔ موسموں کے تغیرات کو سہنا ہے۔ آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ اگر اِسی طرح ثابت قدم رہیں تو بہت جلد منزلِ مقصود پا لیں گی۔

یہ پیشین گوئی میں اِس لیے کر رہا ہوں کہ اُن کی شاعری میں حیات و کائنات کی حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں۔ صائمہ اسحاق سچائی کی صورت گر ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور زندگی کے نشیب و فراز سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُن کی شاعری میں زندگی حرکت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ صائمہ اسحاق کسی نظریے کے تحت شاعری نہیں کرتیں، وہ ایک آزاد فکر و نظر کی حامل شاعرہ ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نظریے کے تحت کی گئی شاعری کبھی بڑی شاعری نہیں ہوتی۔ اُن کے یہاں نسوانیت کا اظہار بھی ملتا ہے اور ارمان، خواہش اور حسرتوں کا بیان بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں ہر قسم کے قاری کی پسند کی گونج سنائی دیتی ہے اور ہر قاری اُن کی شاعری کو پسند کرنے لگا ہے، اُن کے مداحین میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میری دنیا سے سیاہی کا گلہ تھا اُس کو
میرا سورج تو سوا نیزے پہ آنے دیتا

☆

اب مجھے ہارنا ہو گا کہ مرے دشمن نے
اپنے ہتھیار مری شان میں رکھ چھوڑے ہیں

☆

آج ثابت بھی کرے صائمہ اپنا ہونا
مار ڈالا ہے تو چھاؤں میں بھی ڈالے آ کر

راہِ سخن انتہائی دشوار گزار اور کٹھن ہے۔ یہاں دشمنوں سے زیادہ اپنوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ہر تخلیق کار کے ساتھ خلاقِ کائنات ہوتا ہے، وہ کسی کی بھی تخلیق کو رُسوا نہیں ہونے دیتا، کیوں کہ وہ خود تخلیق کار ہے لہٰذا صائمہ اسحاق کو اُسی پر بھروسا کر کے شاعری کا سفر تسلسل سے جاری رکھنا ہوگا، تبھی وہ اپنی کاوشِ سخن کے پودے کو تناور شجر بنا سکتی ہیں اور اُس کا سایہ اور اثمار پا سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

کرشن چندر کے دل میں کھُبا چاقو

واقعہ کچھ یوں ہے کہ وادی کشمیر کے چھوٹے سے قصبے علی آباد میں جب کرشن چندر کے والد بطور ڈاکٹر تعینات تھے تو وہ کرشن چندر کو جن کی عمر اس وقت بمشکل نو دس برس تھی اپنے ساتھ لے کر شاہی محل راجہ بلدیو سنگھ کو دیکھنے گئے جو ان دنوں بہت بیمار تھے۔ اس دوران کرشن چندر دیگر بچوں کے ساتھ محل کے ایک حصے میں کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ ان بچوں میں راجہ صاحب کے دو راجکمار بھی شامل تھے۔ بچے اپنی قیمتیں چیزیں ایک دوسرے کو دکھانے میں مصروف ہو گئے۔ آخر میں وہ بچے کرشن چندر کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ڈاکٹر کے بیٹے تمہارے پاس کیا ہے دکھانے کو۔ کرشن چندر نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا جو اپنے وطن وزیر آباد سے ساتھ لائے تھے۔ اس کی ہتھی ہاتھی دانت کی تھی اور اس کے تین پھل تھے جو ایک سپرنگ دبانے سے باری باری کھلتے تھے۔ یہ وہ چاقو تھا جو کرشن چندر کو زندگی سے پیارا تھا۔ راجکمار اس چاقو کو دیکھ کر مہبوت ہو گئے۔ ایک راجکمار نے وہ چاقو کرشن چندر سے چھین لیا اور اپنی جیب میں ڈال کر کہا یہ چاقو ہم لیں گے۔ دوسرا راجکمار وہ چاقو چھیننے لگا اور کہنے لگا نہیں اس کو ہم رکھیں گے۔ کرشن چندر نے ایک راجکمار کے چہرے پر دھر کے چانٹا مارا، جواب میں دونوں راجکمار اور باقی لڑکے کرشن چندر پر پل پڑے اور ان کی خوب پٹائی کی۔ کرشن چندر رونے لگے، ان کے رونے کی آواز سن کر ان کے والد آئے اور انہوں نے پوچھا کیا بات ہے تو کرشن چندر نے واقعہ سنایا اور کہا کہ ان سے کہیں کہ میرا چاقو مجھے واپس کر دیں۔ جب ڈاکٹر صاحب نے یہ بات سنی تو انہوں نے بھی کرشن چندر کو مارا اور کہا کہ بدمعاش راجکمار پر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ آگے چل کر کرشن چندر لکھتے ہیں ''قصہ مختصر یہ کہ وہ چاقو مجھے نہیں ملا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ کہ لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔

عامر رضوی

سفید ہتھی والا چاقو، کوئی حسین لڑکی، زرخیز زمین کا ٹکڑا سب اسی طرح ہتھیاتے ہیں پھر واپس نہیں کرتے - اسی طرح تو جاگیرداری چلتی ہے مگر اچھا نہیں کیا ان لوگوں نے۔ دو آنے کے چاقو کے لیے ان لوگوں نے مجھے اپنا دشمن بنالیا۔ وہ سفید چاقو آج تک میرے دل میں کھبا ہوا ہے۔ ایک طرح سے میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے اسی سفید ہتھی والے چاقو کو واپس لینے کے لیے لکھا ہے۔''

کرشن چندر کی تحریر کا یہ اقتباس ان کی چھوٹی سی سوانح عمری ''مٹی کے صنم'' سے لیا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں ان کے دل میں کھبے اس چاقو کا درد اور اثر واضح نظر آتا ہے۔ جب کرشن چندر نے افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت برصغیر ہندوستان سیاسی طور پر انگریز حکومت کی سرپرستی میں ایک کڑے جاگیردارانہ نظام سے گزر رہا تھا - دوسری جانب سوویت یونین میں جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا اور اشتراکی نظام جڑیں پکڑ رہا تھا۔ درست کہ کرشن چندر کو نظریاتی طور پر اشتراکیت پسند کہا جاتا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اشتراکی نظام سے متاثر ہوکر اشتراکی فن تحریر اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اپنی ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنا پر جو کچھ لکھا اس میں اشتراکی رنگ قدرتی طور پر اُمڈ آیا۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ اگر اشتراکی نظام کا کوئی وجود نہ بھی ہوتا تو بھی کرشن چندر نے یہی کچھ لکھنا تھا اور ایسے ہی لکھنا تھا۔ اس کی ایک مثال ان کے شہرۂ آفاق افسانے 'ان داتا' کی اس تحریر سے لی جاسکتی ہے۔ سیاق وسباق کے لیے عرض ہے کہ 1942 کے دوران بنگال میں پڑنے والے قحط نے کرشن چندر کو یہ عظیم طویل افسانہ لکھنے پر مجبور کیا۔ تحریر کا یہ ٹکڑا ایک خط ہے جو ایک غیر ملکی سفارت کار اپنے ملک کی حکومت کو لکھ رہا ہے۔ یہ خط کچھ یوں ہے:

''26/اکتوبر

مسٹر منشی حکومت بمبئی کے ایک سابق وزیر کا اندازہ ہے کہ بنگال میں ہر ہفتے تقریباً ایک لاکھ افراد قحط کا شکار ہورہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری اطلاع نہیں ہے۔ تو نصل خانے کے باہر آج پھر چند لاشیں پائی گئیں۔ شوفر نے بتایا کہ یہ ایک پورا خاندان تھا جو دیہات سے روٹی کی تلاش میں کلکتہ آیا تھا۔ پرسوں بھی اسی طرح میں نے ایک مغنی کی لاش دیکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ اپنی ستار پکڑے ہوئے تھا اور دوسری میں لکڑی کا ایک جھنجنا۔ سمجھ میں نہیں آیا اس کا کیا مطلب تھا۔ بے چارے چوہے کس طرح چپ چاپ مرجاتے ہیں اور زبان سے اُف تک نہیں کرتے۔ میں نے ہندوستان سے زیادہ شریف چوہے دنیا میں اور کہیں نہیں دیکھے۔ اگر امن پسندی کے لیے نوبل پرائز کسی قوم کو مل سکتا ہے تو وہ ہندوستانی ہے۔ یعنی لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مرجاتے ہیں لیکن

زبان پر ایک کلمہ شکایت تک نہیں لائیں گے۔ صرف بے روح، بے نور آنکھوں سے آسمان کی طرف تاکتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں ان داتا، ان داتا۔ کل رات پھر مجھے اس مغنی کی خاموش شکایت سے معمور جامد و ساکت پتھریلی سی بے نور سی نگاہیں پریشان کرتی رہیں۔ ف۔پ۔ب"

کرشن چندر کی اس وقت کی تحریروں سے محسوس ہونے لگا کہ ان کے دل کا درد صرف بچپن میں اپنے چھینے گئے چاقو کے گھاؤ تک مشتمل نہ رہا بلکہ بین الاقوامی حد تک طاقتور قوموں کے ہاتھوں کمزور قوموں کے استحصال نے اس گھاؤ کو ایک کبھی نہ بھر جانے والے زخم میں تبدیل کر دیا۔ جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب برصغیر سلطنت برطانیہ کی ایک نو آبادی تھی۔ کرشن چندر کی ان محسوسات کا اندازہ ان کی کتاب 'یادوں کے چنار' کے ایک باب کی تحریر کے اس ٹکڑے سے لگایا جا سکتا ہے:

"ماں جی نے خوشی اور شرم سے پتا جی کے سینے میں سر چھپا لیا اور رونے لگیں۔ پتا جی بھی رونے لگے، میں بھی رونے لگا۔ کیونکہ ہم ہندوستانی ایک رونے والی قوم ہیں۔ ہماری آنکھوں میں آنسو بہت ہوتے ہیں اور ہم ہر جگہ اور ہر وقت رو سکتے ہیں۔ مگر دوسرے لوگ اکثر اسے ہماری کمزوری پر محمول کر کے ہمارے متعلق غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔ مگر ہم کیا کریں ابھی ہمارے دل کا جذبہ اور ہماری آنکھوں کا پانی نہیں مرا ہے۔ یقیناً جب ہم بہت زیادہ تہذیب یافتہ ہو جائیں گے تو اپنے آنسوؤں سے نفرت کیا کریں گے۔"

یہ درست ہے کہ مٹی کے صنم کرشن چندر کی نہایت مختصر خودنوشت سوانح حیات ہے لیکن میری یادوں کے چنار جسے ان کا ایک ناول گردانا جاتا ہے، دراصل ان کی نیم سوانح حیات ہے۔ یہ مجموعہ ہے ایک بچے کی بچپن کے واقعات کی یادداشتوں کا۔ کرشن چندر کا تمام تر بچپن اور لڑکپن وادی کشمیر کی کھلی فضاؤں میں گزرا۔ اس کتاب میں انہوں نے جس انداز میں کشمیر کے قدرتی حسن کی منظر کشی کی ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ منظر کشی میں اردو زبان کا کوئی بھی ادیب ان کے ثانی کا نہیں۔ تاہم منظر کشی کا فن اپنی جگہ، میری یادوں کے چنار کے ہر باب میں رومانس کی چاشنی یوں گھلی ہوئی ہے کہ قاری اس کتاب کو بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ 1947ء میں تقسیم ہند کے ہاتھوں مجبور ہو کر کرشن چندر بھارت میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تقسیم کے دوران ہونے والے خون آشام فسادات کا اثر راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسین منٹو کی طرح کرشن چندر کی کہانیوں میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ اس بارے ان کا ناول غدار کا مرکزی کردار گو خود

ایک غدار ہے مگر اس کے ذریعے تقسیم سے متاثر لوگوں کی مشکلات کو کرشن چندر نے نہایت چابک دستی سے افسانوی رنگ میں بیان کیا ہے۔ تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کے کرشن چندر کی تحریروں کا طوالت کے پیش نظر یہاں مکمل جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ تاہم ان کا افسانہ 'ایک طوائف کا خط' ان کے بطور افسانہ نگار یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے محسوسات کو بیان کرتے وقت ہر قسم کے تعصب، یہاں تک کہ مذہبی تعصب سے بھی کس قدر بلند رہے۔ اس افسانے میں ایک طوائف کچھ یوں رقم طراز ہے:

''بتول اور بیلا دونوں سگی بہنوں کی طرح میرے پاس رہتی ہیں۔ وہ سگی بہنیں نہیں ہیں۔ بتول مسلمان لڑکی ہے، بیلا نے ہندو گھر میں جنم لیا۔ آج دونوں فارس روڈ پر ایک رنڈی کے گھر پر بیٹھی ہیں---

---میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ راولپنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا۔ وہ انسانیت نہ تھی۔ وہ دشمنی بھی نہ تھی۔ وہ انتقام بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسی شقاوت، بے رحمی، بزدلی اور شیطنیت تھی جو تاریخ کے سینے سے پھوٹتی ہے اور نور کی آخری کرن کو بھی داغ دار کرتی ہے۔ یہ 12 جولائی کا واقعہ ہے۔ بیلا اپنے سکول سے پڑھ کر گھر آ رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے اور دوسرے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے ایک جم غفیر دیکھا۔ یہ لوگ مسلح تھے اور گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور لوگوں اور ان کے بچوں کو اور ان کی عورتوں سے گھر سے باہر نکال کر قتل کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے جاتے تھے۔ بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے دیکھا پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وحشی مسلمانوں نے اس کے پستان کاٹ کر پھینک دیئے تھے۔ وہ پستان جن سے ایک ماں کوئی ماں، ہندو ماں یا مسلمان ماں، عیسائی ماں یا یہودی ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور انسان کی زندگی میں، کائنات کی وسعت میں تخلیق کا نیا باب کھولتی ہے۔ وہ دودھ بھرے پستان اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کاٹ دیئے گئے۔ کسی نے تخلیق کے ساتھ اتنا ظلم کیا تھا، کسی ظالم اندھیرے نے ان کی روحوں میں یہ سیاہی بھر دی تھی---

(آگے چل کر وہ مسلمان لڑکی بتول کے بارے میں لکھتی ہے) ---ان پڑھ بتول چند دن ہی ہوئے میرے پاس آئی ہے۔ ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی میں نہیں کہہ سکتی۔ ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے کہ اگر آپ اسے سن لیں تو شاید پاگل ہو جائیں۔ بتول بھی اب نیم پاگل ہے۔

اس کے باپ کو جاٹوں نے بے دردی سے مارا ہے کہ ہندو تہذیب کے پچھلے چھ ہزار کے چھلکے اتر گئے ہیں اور انسانی بربریت اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آ گئی ہے۔ پہلے تو جاٹوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا پھر اس کے حلق کو چیر کر اس کی آنتیں تک نکال ڈالیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا۔ اس وقت ان کے باپ کی لاش کے سامنے ریحانہ، گل درخشاں، مرجانہ، سوہن بیگم سب کو ایک ایک کر کے وحشی انسانوں نے اپنے مندر کی عورتوں کو ناپاک کیا جس نے انہیں زندگی عطا کی، جس نے انہیں لوریاں سنائی تھیں۔ جس نے ان کے سامنے شرم و عجز سے اور پاکیزگی سے اپنا سر جھکا دیا تھا۔ ان تمام بہنوں اور ماؤں کے ساتھ زنا کیا۔ ہندو دھرم نے اپنی عزت کھو دی تھی۔ اپنی رواداری تباہ کر دی تھی۔ اپنی عظمت مٹا ڈالی تھی۔ آج رگوویدکا ہر منتر خاموش تھا۔ آج گرنتھ صاحب کا ہر دوہہ شرمندہ تھا۔ آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا۔ کون ہے جو میرے سامنے اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے، اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے۔ ایلورا کے صنم خانوں کے گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھینچے ہوئے ہونٹوں، اس کی بانہوں پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان اور اس کی بھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمہاری اجنتا کی موت ہے۔ تمہارے ایلورا کا جنازہ ہے۔ تمہاری تہذیب کا قتل ہے۔ آؤ آؤ میں تمہیں اس خوبصورتی کو دکھاؤں جو کبھی بتول تھی۔ اس متعفن لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔''

اور پھر مٹی کے صنم میں فسادات کا ذکر تے ہوئے کرشن چندر بتاتے ہیں کہ تقسیم کے وقت تک علی آباد (جواب پاکستان کا حصہ ہے) کے ڈاک بنگلے میں ایک ہندو برہمن لڑکا دتا رام بطور باورچی کام کرتا تھا۔ تقسیم کے وقت سب ہندو وہاں سے ہجرت کر گئے مگر دتا رام وہیں مقیم رہا۔ مسلمان گھرانوں نے بڑی مشکل سے کسی دور آفتادہ گاؤں میں ایک ہندو لڑکی ڈھونڈ کر دتا رام کی شادی کروا دی۔ تو اس پہ تقسیم کے زیرِ اثر ہونے والے فسادات پہ اپنا نظریہ کرشن چندر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''میں نہیں کہہ سکتا آج کیا حالت ہے۔ گنگا رام کا بیٹا دتا رام اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ علی آباد کے ڈاک بنگلے میں ہے یا کسی فرقہ وارانہ فساد میں مارا گیا کہ کسی حملے میں بھاگ کر وہاں سے چلا گیا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

مگر میری نگاہیں اسے آج بھی علی آباد کے ڈاک بنگلے میں ڈھونڈتی ہیں۔ میری نظر میں آج بھی علی آباد کے ڈاک بنگلے میں اس برہمن زادے کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا یہ ضروری ہے کہ دلی کی جامع مسجد نمازیوں

سے بھری رہے۔"

اس پہ مزید تبصرہ کیے بغیر میں آگے بڑھتا ہوں اور وہ یہ کہ افسانہ نویسی کے علاوہ کرشن چندر نے فلمی دنیا میں بھی اپنے جوہر آزمائے۔ مگر یہاں انہیں ان کے مقام کے مطابق کامیابی نہیں ملی۔ اب اگر کرشن چندر پہ لکھی گئی تنقید کی بات کریں تو پروفیسر عبدالسلام صدیقی کی کتاب کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ سامنے آتی ہے۔ پروفیسر صاحب کا یہ اعتراض تو درست ہے کہ کرشن چندر بسیار نویسی کا شکار رہے، کل ملا کر کرشن چندر نے اڑھائی سو کے قریب افسانے اور ناول تصنیف کیے۔ ان کی کچھ کہانیاں حقیقت سے کچھ یوں دور ہو جاتی ہیں کہ انہوں نے اپنے تخیل پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا۔ تاہم پروفیسر صاحب کا کرشن چندر سے منشی پریم چند کا موازنہ کرنا کسی طور بھی جائز نہیں۔ مگر پروفیسر صاحب کرشن چندر کو کمتر ثابت کرنے میں اسقدر آگے بڑھ گئے کہ پوری کتاب کرشن چندر کی ادبی خامیوں سے اٹی ہوئی ہے اور وہ کرشن چندر کو افسانہ نگار ماننے سے ہی منکر نظر آتے ہیں۔ سادہ سا سوال ہے کہ کیا کرشن چندر کسی بھی ایک وجہ سے سراہے جانے کے قابل نہیں؟ بہرحال سب جانتے ہیں کہ منشی پریم چند کے افسانوں میں ایک تو ویسے ہی دیہی زندگی کا رنگ نمایاں ہے، دوسرے یہ کہ ان کے افسانے زندگی کے سیدھے سادے واقعات اور مسائل کے بارے میں ہیں۔ جبکہ کرشن چندر کی کہانیوں میں انواع اقسام کے رنگ شامل ہیں۔ مثال کے طور پر معاشرے میں موجود طبقاتی فرق اور اس کا زندگی پر اثر۔ طنز و مزاح کا رنگ۔ گھٹے ٹنگ گلیوں کے بوسیدہ ماحول کے ساتھ ساتھ کھلی فضاؤں کی ہمیشہ محسوس کی جانے والی تازگی اور سب سے بڑھ کر انسانی زندگی میں رومانس کی اہمیت کرشن چندر کی تحریروں کا طرہ امتیاز ہے۔ مثال کے طور پہ ذرا اس جملے کو ملاحظہ فرمایئے:

"عبدل وہ بدنصیب نہیں تھا جس نے کبھی محبت نہیں کی تھی۔" میں نہیں جانتا کہ پروفیسر صاحب یہ جملہ کس حد تک پورا اترتا ہے۔

قارئین کرام، اس مضمون کے عنوان سے جڑے رہنے کی بنا پر کرشن چندر کی نجی اور ذاتی زندگی کے بیان سے گریز کیا گیا ہے۔ باقی رہا رومانس کا بیان بطور کرشن چندر کی کہانیوں کا طرہ امتیاز، تو ان کی کہانی گرجن کی ایک شام کا آخری جملہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جی ہاں! وہ اپنی کہانی گرجن کی ایک شام کا اختتام جس ایک جملے پہ کرتے ہیں، میں اس مضمون کا اختتام بھی جملے پہ کرتا ہوں۔ وہ جملہ کچھ یوں ہے:

'ایک چرواہی نے سانس روک کر پوچھا پھر کیا ہوا۔'

☆☆☆☆

''دھند کی دیوار'' سے ''پچھتاوا'' تک

تبسم ریحان کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''الجھے دھاگے'' واہ اور ٹیکسلا کی ادبی فضا میں ایک خوشگوار حیرت لے کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اردو نظم اور غزل کے ایک مکمل اور معتبر شاعر کو افسانے کے میدان میں اترنے کی کیا ضرورت آن پڑی جبکہ اس نے بحیثیت شاعر نہ صرف اپنی شناخت بنائی بلکہ اس شناخت کو مستحکم بھی کر لیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تبسم ریحان راز داری والا شاعر ہے اور سات پردوں میں رہ کر اپنی وضع داری اور راز داری کے ساتھ شعر کہہ رہا ہے جیسے:

تُو کہے تو کھینچ لوں اپنی زباں
بول کتنی راز داری چاہیے

.....

افسانہ اس قدر راز داری کا متحمل نہیں ہوتا جتنی راز داری شاعری کے مزاج میں ہوتی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اس کے اندر چھپے رازوں نے اس کے اندر کی دنیاؤں میں ایک طوفان برپا کر رکھا تھا جسے باہر نکلنے کے لیے شاعری کا ساگر اسے چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اندر کی باتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنے انخلا کے لیے کوئی اور راستہ ڈھونڈنے کا تقاضا کر رہا تھا شاید اسی لیے تبسم ریحان نے بہت پہلے کہہ دیا تھا:

بہت ہی مضطرب میرا بدن ہے
مجھے رقاص ہونا چاہیے تھا

.....

انہیں شاعری کی نسبت افسانے کا کینوس بڑا محسوس ہوا اور اپنے اظہار کے لیے افسانے جیسی صنف کا سہارا لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوی اظہار میں کس حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے باتیں بہت زیادہ ہیں جو ان کے اندر قطار در قطار کھڑی ہیں اور باہر نکلنے کے لیے اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ افسانے کی صنف بھی ان کی باتوں کے انخلا کے لیے کم پڑ جائے گی اور یہ ناول کی طرف بھی آئیں گے کیونکہ ان کی باتوں کی لہریں اچھل اچھل کر افسانے کے ساگر سے بھی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہیں یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ تبسم ریحان ایک عرصہ سے شاعری

رانا سعید دوشی

کی طرف کروٹ لے کر لیٹا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف افسانہ انہیں بلک بلک کے کہہ رہا تھا کہ میری طرف منہ کر کے سوئیں۔ اس لیے ان کے اضطراب کو کروٹ بدل کر افسانے کی طرف منہ کرنا پڑا۔ انہوں نے ابھی افسانے کو کہانیوں کی تھپکیاں دے دے کر سلایا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ بہت جلد ان کے دل کے تیسرے کمرے سے ناول کے کراہنے کی آواز آئے گی اور وہ اس کی خبر گیری کے لیے تیسرے کمرے میں جائیں گے اور ناول کو تھپکی دے کر سلانے کی کوشش میں رات بھر جاگیں گے۔

افسانے کے حوالے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ افسانے کا سچ حقیقت کے سچ سے بھی بڑا سچ ہوتا ہے، یہ وہ سچ ہوتا ہے جسے سن کر معاشرہ افسانے سے آنکھیں چرانے لگتا ہے۔ تبسم ریحان کا افسانہ بھی ایسے ایسے سچ بولتے ہوئے آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے افسانوی سچ کو کسی کے آگے جواب دہ ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے اسی لیے اس کا افسانہ سچ بول کر بھاگتا نہیں بلکہ چہل قدمی کے انداز میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ اسے اپنے اختتام تک پہنچنے کی جلدی نہیں ہوتی اور یہ عددی بسرام کرتا ہوا چلتا رہتا ہے۔

اب ان کے افسانوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''دھند کی دیوار'' اپنی عصری نفسیات کی جھیل میں ایسا کنکر ہے جو طرح طرح کے دائرے بناتا محسوس ہوتا ہے اور سماجی الجھن اور گھٹن کو اپنے قلم کے روشن دان سے باہر نکلنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس کے افسانے میں معاشی، معاشرتی، سماجی، اقتصادی، انفرادی اور اجتماعی تالاب کے تعفن بھرے پانیوں کے اخراج کے لیے طاقچے بنانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے تازہ اور رواں پانیوں کو بہاؤ دے کر ان تالابوں کو نئے سرے سے بھرنے کی کوشش بھی خاص طور پر نظر آتی ہے۔

تبسم ریحان دھند کے پار کے مناظر نہ صرف خود دیکھتا ہے بلکہ قارئین کو بھی دکھاتا ہے، عمروں کے فرق کو پاٹ کر دو کناروں کو آپس میں ملاتا بھی دکھائی دیتا ہے۔

اس کے بعد ''بس ایک سنگ اٹھا'' کر معاشرتی رہن سہن کے بت کی طرف اچھال دیتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ سنگ معاشرتی بت کو طمانچے کی طرح لگتا ہے کہ نہیں۔۔۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک بچہ سڑک کے کنارے پڑا پتھر اٹھا کر محمد دین کو مارتا ہے اور محمد دین کے منہ سے صرف ''اوئے'' کی آواز آتی ہے جس پر مرزا انکل غصے میں چیختے ہیں،

''وٹا نئیں مارنا کتی دیا پترا وٹا نئیں مارنا''

اس پڑاؤ کے بعد تبسم ریحان کے ''الجھے دھاگے'' میں سہیل، سلمان اور مسرت اس بری طرح الجھتے ہیں کہ جس کا بجز مرگ کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ اس افسانے میں معاشرے کے چیل، کوے، گدھ، کتے اور بھیڑیے عورت کو محض گوشت کا لوتھڑا سمجھ کر نوچتے اور بھنبھوڑتے صاف دکھائی

دیتے ہیں۔

تبسم ریحان اپنے افسانے میں اپنی شخصی اور ذاتی وضع داری کے سبب بہت سارے مناظر ملفوف بھی کر جاتا ہے۔ اس کے سادہ بیانیہ میں روشنی اور ادراک کی ایسی باریکیاں بھی ہیں جن کو قاری اپنے اندر کی خوردبین کی مدد سے ہی دیکھ سکتا ہے۔ جیسے:

''اچھا تو بشیراں کی بیٹی ہے؟ آ میں تیری ملاقات کراتا ہوں'' ''ماں سے مل کر ذرا ہم سے بھی مل لینا''

گو کہ تبسم ریحان کے افسانوں کا یہ سچ کوئی نیا سچ نہیں ہے مگر انہوں نے اپنے بیانیے میں اسے کہیں کہیں نیا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جیسے ان کا آخری افسانہ ''پچھتاوا'' جس کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے: ''رفعت! کیا ہوا تمہیں؟ میں نے کوئی زبردستی تو نہیں کی، تم بھی تو یہی چاہتی تھی نا'' ''میں بیٹا چاہتی تھی کمینے انسان! چھوڑ میرا ہاتھ'' میرا خیال ہے کہ یہ افسانہ یہیں پر ختم ہو گیا، آگے کا جملہ اضافی ہے۔

تبسم ریحان کا ایک اور افسانہ ''میریلیا کا کتا'' بھی کچھ نئے انداز کا افسانہ ہے۔ اس کا مزاج روسی اور فرانسیسی افسانوں سے ملتا جلتا ہے اور یہ افسانہ ایک اور معاشرے کے مسائل کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی غمازی بھی کرتا ہے۔

ان کا ایک اور افسانہ ''بیبا بندہ'' بھی کمال افسانہ ہے۔ میں ان کے اس افسانے کو ان کے ایک اور افسانے ''الجھے دھاگے'' کے ساتھ الجھا کر بات کرنا چاہوں گا۔ ''الجھے دھاگے'' کی مسرت اور ''بیبا بندہ'' کا رونی--- اگر دیکھا جائے تو الجھے دھاگے کی مسرت پر ظلم کے جو پہاڑ ٹوٹے ان میں شاید کہیں کہیں اس کی اپنی ذات اور مزاج کا عمل دخل بھی تھا۔ مگر ''بیبا بندہ'' کے رونی کا کیا قصور تھا؟ کہ معاشرے نے اسے اندھیری کوٹھڑی میں مرنے کے لئے بند کر دیا۔ وہ اگر ہیجڑہ پیدا ہوا تو اس کا اپنا کیا دوش؟ اگر وہ بھائی کے ساتھ کھیلتا تو وہ کہتا ہے کہ جا لڑکیوں کے ساتھ کھیل، بہنوں کے ساتھ کھیلتا تو وہ کہتی ہیں کہ جا لڑکوں میں کھیل۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی تخلیق کار کی تخلیق میں کوئی کجی ہے تو اس کا ذمہ دار تخلیق کو ٹھہرانا قرینِ قیاس نہیں۔ اس میں بھلا تخلیق کا کیا قصور؟ وہ اپنا دکھ کس کے آگے بیان کرے۔ وہ تو شاہ حسین کے بقول یہی کہے گا ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' جی ہاں ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' بھی تبسم ریحان کا خوب صورت افسانہ ہے جس میں تخلیق کار کرب سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ تخلیقی اضطراب کی موجیں معاشرتی سمندر کے ساحلوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس طرح سر پھوڑتی رہتی ہیں۔ شاید انہیں یہ سمندر بھی چھوٹا لگتا ہے۔ جیسے غالب نے کہا تھا:

بازیچہء اطفال ہے دنیا میرے آگے

☆☆☆☆☆

جدیدیت/ مابعد جدیدیت اور اردو افسانہ

سید تحسین گیلانی

پریم چند نے جس زمانے میں افسانہ نگاری کی شروعات کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا پرآشوب زمانہ تھا اور پریم چند انسان دوستی اور وطن پرستی کے جذبات سے سرشار تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے عہد میں پرورش پارہی مریضانہ صورت حال کو منظر عام پر لاکر اس کی اصلاح کے لئے حقیقت نگاری کی راہ اختیار کی اور اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا، جس تحریک نے قدیم تصورات وعقائد کو توڑ کر ادب کی تخلیق کرنے کے جو اصول ونظریات وضع کئے اس میں 'ادب برائے زندگی' کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی اور اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ اردو افسانے پر ترقی پسند تحریک کے بہت گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کا اردو افسانے پر یہ احسان بھی ضروری ہے کہ اس تحریک نے اردو افسانے کو بیش بہا موضوعات دیئے لیکن ملک کو آزادی دلانے اور ساری، خارجی مسائل کے تمام امکانات کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے بعد جدت سے محروم ہوکر ترقی پسند تحریک یکسانیت کا شکار ہوگئی تو جدید آگہی کے نئے افسانہ نگاروں

نے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لئے ردعمل کے طور پر اس کے خلاف آواز اٹھائی اور خارجی مسائل کی جگہ داخلی جذبات کو اپنا محرک بنایا اور ۱۹۶۰ء تک آتے آتے ترقی پسند تحریک کے مروجہ اصول نظریات سے مزید انحراف کے نتیجے میں اردو افسانے کے افق پر جدیدیت کا رجحان طلوع ہوا۔ اس رجحان کے حامی افسانہ نگاروں نے ماقبل ترقی پسند روایت سے جدا نظر آنے کی شعوری کوشش کی۔ اس کوشش کو انجام دینے کے لئے افسانہ نگاروں نے ادب کا ایک نیا منظر نامہ مرتب کیا، جس کے تحت افسانے کے مواد، ہیئت، اسلوب اور تکنیک میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اگر دیکھا جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعد اردو افسانے پر جس رجحان نے سب سے زیادہ نقوش ثبت کیے، ان میں جدیدیت کا نام سب سے نمایاں ہے۔

جدیدیت کے تحت علامتی اور تجریدی افسانے لکھنے والوں کی تعداد کافی طویل ہے، جن میں بلراج مین را سریندر پرکاش، انتظار حسین، جوگیندر پال، انور سجاد، خالدہ اصغر، غیاث احمد گدی، بلراج کومل، دیوندر اسر، کمار پاشا، انور عظیم، اکرام باگ، حمید سہروردی، ظفر اوگانوی، کنور سین، شفیع مشہدی، انور خان، رضوان احمد، انور قمر اور قمر احسن وغیرہ شامل ہیں۔

گو کہ جدیدیت ایک بین البراعظمی تحریک ثابت ہوئی جو بیسوی صدی کی مختلف دہائیوں میں مختلف ممالک میں پھیلی مثلاً فرانس میں 1890 سے 1940 اس کا زمانہ مانا جاتا ہے، روس میں قبل از انقلاب تا 1920 یہ مروج رہی، جرمنی میں 1890 تا 1920 اور انگلستان میں بیسوی صدی کے آغاز سے 1930 تک اور امریکا میں پہلی جنگِ عظیم سے لے کر دوسری جنگِ عظیم تک اس کا چلن رہا۔

پھر جدیدیت کے بعد کے دور کو مابعد جدید دور کہا گیا جس نے اردو افسانے پر بھی اپنے گہرے نقوش مرتب کیے۔ اب ان ادوار کو الگ کیسے کیا جائے یہ دیکھنا ہوگا۔ چلیں علمائے ادب کا اس حوالے سے کیا کہنا ہے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مابعد جدیدیت ایک وجدانی نظریے کا نام نہیں بلکہ مابعد جدیدیت کی اصطلاح کا احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویوں کا جس کی تہہ میں بنیادی بات تخلیق کی آزادی اور معنی پر بٹھائے ہوئے پہرے

یا اندرونی اور بیرونی دی ہوئی لیک کو رد کرنا ہے۔ یہ نئے ذہنی رویے، نئی ثقافتی اور تاریخی صورت حال سے پیدا ہوئے ہیں اور نئے فلسفیانہ قضایا پر بھی مبنی ہیں گویا مابعد جدیدیت ایک نئی صورت حال بھی ہے یعنی جدیدیت کے بعد کا دور مابعد جدیدیت کہلائے گا لیکن اس میں جدیدیت سے انحراف بھی شامل ہے جو ادبی بھی ہے اور آئیڈیالوجیکل بھی۔ آئیڈیالوجی سے مراد یہاں کوئی فارمولہ یا کسی سیاسی پارٹی کا کوئی منصوبہ بند پروگرام نہیں بلکہ ہر طرح کی فارمولائی ادعائیت سے گریز یا تخلیقی آزادی پر اصرار یا اپنے تشخص پر اصرار بھی ایک آئیڈیالوجی ہے۔"

شوکت حیات مابعد جدید افسانے کے بارے میں ہوں قطراز ہیں:

"مابعد جدید افسانے نے کرداروں کو ان کے چہرے واپس کئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں اور پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو توڑا ہے، انہیں زندگی کی آزاد فضا میں از خود نقل و حرکت کا موقع فراہم کیا ہے، ان کے چہروں کے طبقاتی اور ثقافتی بیک وقت دونوں تشخص کے نشانات کو فوکس کیا ہے۔ مابعد جدید افسانہ دائرے سے کہیں کچھ چھوٹا نہیں اور جو کچھ چھوٹا ہے وہ از کار رفتہ اور تخلیقی طور پر غیر آمد ہوتا ہے۔"

وہاب اشرفی نے مابعد جدیدیت کی تعریف اس طرح کی ہے:

"مابعد جدیدیت ایک Complex صورت ہے جس نے روشن خیالی، آزادی جنس بل کی زندگی کے بیشتر گوشوں کو نئے اور متنوع ڈسکورس سے ہم کنار کر دیا ہے۔"(۲)

مابعد جدیدیت، جدیدیت کی ضد نہیں البتہ الگ ضرور ہے اور اس کے بنیادی عناصر منحرف بھی ہیں - مابعد جدیدیت ان بنیادوں کو کالعدم کرتی ہے جن پر جدیدیت کا انحصار ہے۔ یعنی بیگانگی، شکست ذات، حد سے بڑھی ہوئی داخلیت، لایعنیت اور غیر ضروری ہیئت پرستی، جوابہام، اشکال اور رعایت لفظی سے آگے نہیں سے بڑھتی۔ مابعد جدید افسانے میں اسلوب، زبان بیان اور تکنیک کی سطح پر تبدیلیاں ہوئیں اور یہ وہ اوصاف ہیں جو مابعد جدید افسانے، جدید اور ترقی پسندی سے مختلف ہے۔

☆☆☆☆☆

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مرزا اسد اللہ خان غالب

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

.....

مرزا اسد اللہ خان غالب شاید ہی ایسا کوئی شخص ہوگا جو اس نام سے واقف نا ہو۔ اردو شاعری میں مرزا غالب کی حیثیت ایک درخشاں ستارے کی سی ہے۔ غالب نے اپنے کمالِ فن سے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسے نئے نئے موضوعات بخشے اور اردو ادب میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ غالب نے اردو غزل گوئی میں اپنا الگ مقام بنایا۔ وہ دوسروں کی راہ پر چلنے سے کتراتے رہے۔ غالب کا ماننا تھا کہ ''دوسروں کے پیچھے چلنے سے آدمی اپنی منزل کھو دیتا ہے۔ اس لئے جس راستے سے کارواں گزرا ہے اس راستے پر چلنا پسند نہیں کرتا''

۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ غالب آگرہ میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے لڑکپن میں ہی شاعری لکھنا شروع کی تھی لیکن زندگی کی تلخی نے انہیں زندگی بھر نہیں چھوڑا۔ انھیں اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں بھی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی پریشانیوں کے سبب مجبور ہو کر انھوں نے شاہی دربار میں نوکری کر لی۔ اور وہاں سے زندگی کی سوجھ بوجھ سنبھال لی۔ لیکن زندگی کے ظلم نے مرزا اسد اللہ خان غالب کو یتیم بنانے پر مجبور کر دیا اور والد کا سایہ ہاتھ سر سے کیا اٹھا کہ زندگی کی ہر طوفان نے آن پکڑا جس سے غالب کی زندگی بہت بگڑی۔ ایک جگہ غالب نے خود کہا ہے کہ ''جتنی بڑھتی گئی پیری میری شاعری پر جوانی آئی'' اس پیری میں بھی غالب کا درد پوشیدہ ہے اور زندگی کے کٹھن حالات بھی۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دئے ہوتے

.....

غالب نے اردو شاعری میں ایک نئی زندگی کا سانس لیا اور اسے زندگی کی گرمی عطا کی اور شاعری کے ساتھ انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھا۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

تسنیم فردوس

انیسویں صدی کے مرزا غالب ایک مشہور شاعر، ادیب اور نثر نگار تھے۔ آپ برصغیر میں اردو اور فارسی میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے مشہور ہیں۔ غالب نے برصغیر میں مسلمانوں کے زوال سے لے کر برطانوی حکمرانی تک پر آشوب دور کو دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ٹھوس تخیل، دیوالیہ پن، بینائی کی وسعت اور تمثیلوں کا واضح اظہار ہے۔ محبوب کی نازک مزاجی اور زندگی کی تمام تلخی اور پہلوؤں کو نہایت آسان انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ضرب المثال اور استعاروں کا استعمال آپ کے کلام کو چار چاند نصیب کرتا ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

.....

غالب ابتدا میں فارسی میں شاعری کرتے رہے بعد میں اردو شاعری کی۔ غالب کا اردو دیوان مختصر ہے لیکن اسے عالمی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات اور اندازِ بیان میں جدت، شوخی، ظرافت اور دیگر زبان و بیان کی خوبیاں انھیں اردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔

تلاش مجھ کو نہ کر وحشتِ ہنر میں غالب
نگاہِ دل سے دیکھ تیرے کتنا قریب ہوں میں

.....

غالب کی تخلیقات میں دیوانِ غالب، دستنبو، قاطع برہان، میخانہ آرزو، سیاہ چین، قادر نامہ، مکتبِ غالب اور نکہتِ غالب اور تاریخ ہندوستان پر بھی کتب شامل ہیں۔

غالب کا اصل حسن یہ تھا کہ وہ زندگی کی حقیقتوں اور انسانی نفسیات کو گہرائی سے سمجھتے تھے اور اپنی شاعری میں عام لوگوں کو بڑی سادگی کے ساتھ ان کی وضاحت کرتے تھے۔ غالب ایک فلسفی ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کے تخیل کی بلندی اور شوخی فکر کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

.....

غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اسکے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں اسکی ان گنت گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔ انسان کو اسکی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہے اور شبہ نہیں کہ ان کی شاعری میں ان سب کا اظہار و ابلاغ ہوا ہے۔ اور یہ عناصر ان کو عظیم بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔

مرزا اسد اللہ خان غالب بلند پایہ شاعر اور بہترین نثر نگار ہیں۔ غزل گوئی ان کا امتیازی وصف ہے۔ شاعری ان کے وصف کی آواز رہی ہے۔ جس کی گونج دورِ حاضر میں بھی سنائی دیتی ہے اور احساس دلاتی ہے کہ یہ آنے

والے وقت کی بھی آواز رہے گی۔
مہربان ہو کے بلا لو چاہے جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

.....

وقت ان کی چمک کو دھندلا نہ سکی اسی لئے انہیں دو بینی مفکر اور فلسفی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا غالب کی مقبولیت اب بھی اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی۔ دنیائے ادب کی تاریخ غالب کے خاص ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ وہ انیسویں صدی کے غیر معمولی ذہن، حاضر جواب، بذلہ سنج اور دور اندیش فکر شاعر تھے۔
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
غالب اپنے خطوط، قصیدوں اور غزلوں کے لئے خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔
غالب کی غزلوں میں تہ داری پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کا بظاہر جو مطلب پہلی نظر میں فوری طور پر نظر آتا ہے اسکے علاوہ بھی اسکے معنی کے دوسرے پہلو بھی موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تیسرا اور چوتھا پہلو بھی سمجھ میں آتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر پہلو اپنی جگہ درست ہے۔ یہ غالب کی غزلوں کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

.....

مرزا غالب ایک صاحب فکر شاعر تھے غالب اس حوالے سے بھی مختلف و منفرد ہیں کہ وہ خود سے بھی ہم کلام ہوتے ہیں۔ سوالات قائم کرتے ہیں اور سوالوں کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ اپنے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ غالب اپنے اطراف پھیلی ہوئی لامتناہی چیزوں کو من و عن قبول نہیں کرتے بلکہ سبزہ، کوہ، آبشار، تیز و تند ہوا، صحرا، آسمان اور اسکی بلندی، خدا کی قدرت سے متعلق سوالات قائم کرتے ہیں۔
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

.....

غالب کی غزلوں کا بنیادی موضوع بھی غزل کی تعریف کی طرح عشق و محبت ہے۔ تاہم فرق صرف یہ ہے کہ غالب نے اس موضوع اور اسکے دائرے کو وسعت عطا کر دی ہے۔ وہ محض عشقیہ جذبات، احساسات اور کیفیات پیش نہیں کرتے بلکہ اسمیں زندگی کو شامل کرتے ہیں۔
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

.....

غالب نے اردو غزل کی روایت میں تصوف سے جو رمز و ایمائیت پیدا کی اسے اپنے لئے شمع راہ بنایا۔ یوں انھوں نے سیاسی اور تہذیبی، معاشرتی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی۔
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ان کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ان کی شخصیت کی کامل تصویر ان کے خطوط میں دیکھی جاسکتی ہے۔ غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ایک ہنگامی دور تھا۔ ایک طرف پرانی تہذیب مٹ رہی تھی اسکی جگہ جدید تہذیب اور تعلیم اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھیں۔ یوں انتشار اور آویزش کے اس دور میں ان کی تشکک پسندی کو مزید تقویت ملی۔ انھوں نے زندگی کی بڑی بڑی اور گہرے مطالب کو رمز وایما کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

غالب اردو میں پہلے شخص ہیں جس نے اپنے خطوط میں اپنی شخصیت کو بےنقاب کیا ہے۔ غالب کی شخصیت گہری انفرادیت تھی وہ راہ گیر نہیں تھے۔ وہ فطرت کے لحاظ سے ایک راہ راست تھے۔ غالب نے جس جدید نثر کی بنیاد رکھی تھی اس پر سرسید اور ان کے ساتھیوں نے ایک جدید اور مرئی عمارت تعمیر کی۔ سادگی نرمی، خلوص اور سادگی مجسم اور پیچیدہ انداز کے اظہار کے بجائے یہ ساری خوبیاں جدید نثر کی علامت ہے۔ غالب نے بغیر القاب وآداب کے آپسی گفتگو کی طرح خط لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو مزاح کا احساس تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب وہ انسان ہیں جس کے نقشِ قدم زمین پر ٹکے ہوئے ہیں۔ جس میں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں اپنے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور اس طرح لکھا ہے کہ اگر اس مواد کو ترتیب دیا جائے تو اس سے غالب کی خودنوشت سوانح تخلیق ہوتی ہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے غالب اپنے دکھوں اور خوشیوں، خواہشات اور آرزوں، اپنی مایوسیوں اور، شکستوں، خوشیوں کے ساتھ پایا جائیگا۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہوگئیں

اردو کے عظیم شاعر اور نثر نگار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ کو دہلی میں انتقال کر گئے۔ اتنا زندہ دل اور ذہین شاعر اپنے عمر کے آخری برسوں میں حالات کی ستم ظریفی سے دوچار نظر آتا ہے۔ کوئی مسافر سایہ دار درخت کی تلاش میں بڑھتا چلا جائے مگر اسے لامتناہی زمین اور اوپر آسمان کے سوا کچھ نہ دکھائی دینے لگا تھا۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

.....

لیکن جب تک اردو زندہ رہے گی تب تک ان کا نام امر رہے گا اور جب تک اردو شاعری زندہ رہے گی غالب کا نام غالب ہی رہے گا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

☆☆☆☆☆

لو ہو گیا سویرا [ایک تحسینی نوٹ]

بچوں کا ادب خصوصاً بچوں کی نظمیں اور کہانیاں پڑھتے پڑھتے بندہ خود کب ادب لکھنے کے قابل ہوتا ہے یا لکھنا شروع کر دیتا ہے، یہ ایک ایسا راز ہے جو سب پر عیاں ہے۔ ہمارے معاشرے میں طلب و رسد کا اشاریہ مرتب کرنے کا کوئی معیاری ادارہ ہے نہ ہی کوئی معیاری شخصیت، جو اس اہم کام کو سرانجام دے۔ سو اس لیے معاشرہ پوری طرح بے ترتیبی کا شکار ہو چکا ہے، ہمیں کہاں کہاں اصلاح کرنی ہے کہاں مکمل صفائی کرنی ہے کہاں ابتدا کرنی ہے کچھ بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو رہا۔

اسی لیے، ہم نے شاعری/افسانے/تنقید/طنز و مزاح کو ہی ادب سمجھ لیا ہے، اور اس سارے کھیل تماشے میں بچوں کا ادب چاہے وہ کہانی ہو نظم ہو چاہے پہیلی ہو، کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ بچوں کے ادب پر جب بھی بات ہوتی ہے اشتیاق احمد کا ذکر ہوتا ہے۔ نظموں کا ذکر ہو تو کچھ سبق آموز نظمیں علامہ اقبال کے مجموعے کلام بانگ درا کے حصہ اوّل سے لی جاتی ہیں۔ ان میں بھی زیادہ نظمیں انگریزی شاعری سے ماخوذ ہیں۔ ان میں ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، پرندے کی فریاد، ماں کا خواب یا پھر ولیم کوپر کی نظم سے ماخوذ ہمدردی کے عنوان سے لکھی گئی نظم زیادہ مقبول ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی بہت سی نظموں میں سے ایک نظم:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

بہت مشہور ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی بچوں کے حوالے سے کچھ کام کیا اور جلیبیوں کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی بچوں کو کچھ آسانی سے سمجھانے کے لیے حامد نقوی صاحب نے سبزیوں اور پھلوں پر

اعجاز رضوی

نظمیں لکھیں، مگر آج جس کتاب پر بات ہو گی یہ ایک لاجواب کتاب ہے نام ہے "لو ہو گیا سویرا" اس کتاب میں بھولی بھالی معصوم سی نظمیں ہیں اور مسلسل نظمیں ہیں اور شاعر ہیں پروفیسر شاہ محمد سبطین شاہجہانی صاحب۔
سبطین صاحب نے ایک وقت میں غزلوں میں نام پیدا کیا مشاعرے پڑھے، مشاعرے کروائے۔ سید عابد علی عابد، عبدالحمید عدم جیسے ذہین و فطین شعرا سے سیکھا۔ ادب کو اوڑھنا، بچھونا بنایا، مگر پھر رفتہ رفتہ، صوفی ازم کی طرف مڑ گئے۔ اور حمد و نعت، عقیدت اور صوفیا کرام کی خدمات پر بات کرنے لگے، اور ایک وقت آیا جب خود بھی ایک پیر کامل کے روپ میں سامنے آنے لگے۔ مذہبی خدمات انجام دیتے دیتے، یکدم بچوں پر شفقت کی مثال کم ہی ملتی ہے، مگر سبطین شاہجہانی صاحب نے، اپنے قلم کو ہی مجبور نہیں کیا بلکہ اپنے دل کو بھی مجبور کیا کہ وہ بچوں کو دعائیں دینے کے ساتھ ساتھ کچھ عملی طور پر بھی کام کرے، آپ کے مریدوں کو سلام جنھوں نے آپ کے کام کو محفوظ بھی کیا اور مشہور بھی۔ "محترم سامعین" شاہ محمد سبطین شاہجہانی صاحب نے جو نظمیں تخلیق کی ہیں، وہ دیگر تمام شعراء سے مختلف ہیں۔
ان کی ایک نظم مٹی کا دیا کے عنوان سے ہے۔
وہ کہتے ہیں کہ:

کہتے ہیں کہ اک نیک دل بڑھیا نے مٹی کا دیا
اک اندھیرے راستے پر لا کے روشن کر دیا

.....

یہ دیا تاریکیوں میں جل رہا ہے اس طرح
اک شکستہ ناؤ طوفانوں میں تیرے جس طرح

ایک مزاحیہ نظم میں فرماتے ہیں:

جہاں دودھ کی دیکھتا ہوں کڑاہی
وہی بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے

جہاں ہو نا پانی نہ تالاب کوئی
وہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

.....

سامعین محترم یہ اشعار اگرچے مزاحیہ اور بچوں کے ادب سے لیے گئے ہیں، مگر اس بات سے ہٹ کر اگر دیکھیں تو یہ اشعار سنجیدہ ادب کے قارئین کے لیے بھی تحفہ ہیں کہ اس میں پورے معاشرے کی تصویر نظر آتی ہے اور اس تصویر کو دکھانے کے لیے، محترم ساجد فراز نے زحمت اٹھائی، جہاں میں محترم شاہ محمد سبطین شاہجہانی صاحب کو پیر کامل سمجھتا ہوں، وہاں ان کے مرید محترم ساجد فراز کو بھی مرید کامل کا درجہ دیتا ہوں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، لوگوں سے ملنا اور خلق خدا کے کام آسان کرنا سب مرید کامل ہونے کی دلیل ہے، میری دعا ہے اللہ تعالیٰ، محترم شاہ محمد سبطین شاہجہانی صاحب قبلہ کعب، اور ان کی تخلیق کو ہمیشہ، عزت و وقار عطا فرمائے اور آج جو ہم کہہ رہے ہیں۔ کل اور سب لوگ بھی کہیں، کہ

لو ہو گیا سویرا

(ایک تقریب میں پڑھا گیا)

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

آخر وہی ہوا جس کا مجھے یقین تھا۔ ایک ماہ میں ہی وہ ہتھیار پھینک گئے۔ خود ساختہ قوت ایمانی جیل کے دال پانی کے آگے دم توڑ گئی۔ جیل کی گرمی، ایئر کنڈیشن کی نرمی کو یاد کرنے لگی۔ ''روزگار فقیر'' بھی آہنی سلاخوں نے روک لیا۔ ہمدردی اور ملاقاتیوں کی تعداد بھی روز بروز گرنے لگی۔ آخر ایک دن حافظ اکبر کا پیغام آیا کہ آپ تو ہمارے پیر ہیں، پتہ نہیں کس نے ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ رؤف ربانی بھی کہہ اُٹھا ''کیمپبل پوریوں کو آپس میں نہیں لڑنا چاہیے''۔

وہ رہا ہو کر باہر آئے تو کافی حد تک سدھر چکے

تھے۔ میں رحیم یار خان ساڑھے تین سال رہا۔ میں نے بالخصوص حافظ اکبر اور قاری حماد اللہ شفیق کو انتظامیہ کو مددگار اور معاون پایا۔ میں نے بھی ان کی پوری تکریم کی اور کسی گلے شکوے کا موقعہ نہ دیا۔ علماء اور پریس ملک کے دو ایسے حلقے ہیں جن کے تعاون کے بغیر انتظامیہ فعال نہیں ہو سکتی۔ ہر ڈپٹی کمشنر کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھار غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں یا کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اُسے وقار کا مسئلہ نہیں بنا لینا چاہئے۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو افہام و تفہیم کے ذریعے حل نہ ہو سکے۔ مولوی کے افکار اور روش پر تو بحث ہو سکتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ آج ملک میں جو مساجد آباد ہیں، علی الصبح جو اذان کی روح پرور صدائیں آتی ہیں وہ اسی شخص کی وجہ سے ہیں۔

"وردی کے اندر آدمی" کی تعارفی تقریب: ایس ایس پی انعام الرحمٰن سحری ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی کتاب "وردی کے اندر آدمی" بڑی مشہور ہوئی۔ یہ کتاب اس اعتبار سے منفرد تھی کہ پہلی مرتبہ لوگوں کو احساس ہوا کہ پولیس مین بھی اپنے سینے کے اندر پتھر نہیں بلکہ گوشت پوست کا بنا ہوا دل رکھتا ہے۔ جو دھڑکتا بھی ہے اور دھڑک کر اپنی خوشیوں، غموں، محرومیوں اور مصائب کا اظہار کرتا ہے۔ بظاہر جو رعونت، تکبر اور نخوت سے بھرا ہوا وردی پہنے شخص ہے وہ اندر سے بڑا مظلوم بھی ہے۔ ہر پولیس والا جفا جو اور کینہ پرور نہیں ہوتا بلکہ وفا شعار اور وفا کیش بھی ہوتا ہے۔ ان کی کتاب کی تقریب ہوئی تو رحیم یار خان کے ادبی حلقوں سے ملاقات کا موقعہ ملا۔

میر زاہد: دو آدمیوں نے مجھے بالخصوص متاثر کیا۔ صادق آباد کے میر زاہد صاحب اور خان پور کے خواجہ ادریس۔ میر زاہد صاحب کو دیکھ کر اور ان سے مل کر کچھ یوں گمان ہوتا تھا جیسے میر تقی میر پھر سے دنیا میں تشریف لے آئے ہیں۔ وہی زاویہ قائمہ بناتی ہوئی انانیت، وہی تکلیف دہ حد تک خود پسندی، متعصبانہ حد تک زبان و بیان کا خیال۔ وہی عزتِ نفس۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ میر تقی کسی کے آگے دستِ طمع دراز نہیں کرتے تھے۔ میر زاہد کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ ان کا شمار صادق آباد کے متمول خاندانوں اور بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری پنجاب کی چند بڑی پرائیویٹ لائبریریوں میں سے ایک تھی۔ انہیں صرف کتابیں جمع کرنے کا ہی نہیں بلکہ پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی محل نما کوٹھی غالباً صادق آباد کی سب سے بڑی رہائش گاہ تھی لیکن اس میں بیڈ روم کم اور ریڈنگ روم زیادہ تھے۔ پاکستان میں جب بھی کوئی نئی کتاب چھپتی، پبلشر سب سے پہلے انہیں ارسال کرتے۔ حق بات، ترت کہہ دیتے اور کبھی اس بات کو خاطر میں نہ لاتے کہ ان کا مخاطب کون ہے۔ کبھی کسی افسر کو ملنے نہ جاتے۔ ان کی شہرت کچھ ایسی تھی کہ صاحب ذوق افسر خود ہی ان کے در دولت پر کھنچے چلے

جاتے اور واپسی پر کوئی نہ کوئی علمی موتی سمیٹ لاتے۔ کتاب کسی کو مستعار بھی نہ دیتے۔ البتہ لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت تھی۔ ایک دفعہ ان کا پرانا قلمی نسخہ گم ہو گیا۔ انہوں نے زمین و آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ جب بھی انہیں ملنے جاتا تو اس ''نقصانِ عظیم'' کا رونا روتے نظر آتے۔ ایک دن میں نے ازراہِ تفنن کہہ دیا کہ آپ ایس ایس پی مرزا یاسین کو کہہ کر پرچہ کیوں نہیں درج کروا دیتے۔ اس پر وہ دلگیر لہجے میں بولے ''پرچہ کیسے درج کراؤں اسی پر تو شک ہے۔'' مرزا یاسین کو میں نے بتایا تو بڑا ہنسا۔ بولا کاش مجھے پہلے علم ہوتا تو کتاب پر ہاتھ صاف کر جاتا۔

میر صاحب رحیم یار خان کی تاریخ کے مورخ بھی تھے۔ بڑے لوگوں کی تعریف تو کم ہی کرتے، البتہ ان کی بدحواسیوں اور بوالعجبیوں کے قصے ضرور سناتے۔ غلام میراں شاہ کے دو ہزار سالہ پرانے قرآن شریف کے قلمی نسخے کا واقعہ بھی انہوں نے سنایا تھا۔ رئیس غازی کے متعلق بتایا کہ وہ پچھلگ تھا اس کی ماں ایک گڈریے کی بیوی تھی۔ رئیس کے والد نے ایک دفعہ شکار کرتے ہوئے اسے دیکھ لیا اور اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے گڈریے سے طلاق دلوا کر خود شادی کر لی لیکن اولادِ نرینہ پیدا نہ ہو سکی۔ چنانچہ سوتیلا بیٹا ہی وسیع و عریض جائیداد کا وارث بن گیا۔

جسٹس منیر خان: جسٹس محمد منیر خان کا تعلق بھی صادق آباد سے تھا۔ جج بننے سے پہلے وہ ایک کامیاب وکیل تھے۔ بقول میر زاہد، انہوں نے زندگی میں دو ہی شوق پال رکھے تھے۔ قانون دانی اور عشق بتاں۔ چونکہ شرع کے پابند تھے اس لئے ان کا ہر معاشقہ شادی پر منتج ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ میر صاحب بھی ان کے مدد اور معاون ثابت ہوئے۔

کہنے لگے ''منیر خان میرے پاس آیا تو خاصا پریشان لگتا تھا۔ آنکھیں سرخ، چہرے پر رتجگے کے آثار اور سر پر گنتی کے چند بال اُڑے اُڑے سے۔''

میں نے کہا ''منیر خان خیریت تو ہے؟''

کہنے لگا ''وہی تو نہیں ہے۔'' وجہ پوچھی تو ہاتھ باندھ کر بولا ''سائیں عشق دا کھٹل ہاں'' (شہید عشق ہوں) کریدنے پر پتہ چلا کہ خان صاحب ایک گردوار کی بیٹی پر فریفتہ ہو گئے ہیں اور تیسری شادی کرنے پر مصر ہیں۔ گردآور پس و پیش کر رہا تھا کیونکہ پہلی دو شادیوں سے خان صاحب نے کثیر تعداد میں بچے پیدا کر رکھے تھے اور اس سلسلے میں کسی بھی وقفے کو گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ میر صاحب نے گردوار کو بلا کر سمجھایا کہ اس کے تحصیلدار بننے کا ہر راستہ منیر خان صاحب کی چوکھٹ سے ہو کر گزرتا ہے۔ ان دنوں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ عنقریب ہائی کورٹ کے جج بننے والے ہیں۔

میر صاحب منجم تو نہیں تھے لیکن گزشتہ پندرہ

برسوں سے پیشین گوئی کرتے آ رہے تھے کہ ہر سال ان کی زندگی کا آخری سال ہے۔ اس کی وجہ عارضہ قلب بتاتے تھے۔ میں جب بھی انہیں ملنے گیا تو بستر پر لیٹے ہائے ہائے کر رہے ہوتے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہتے "یہ کم بخت صبح گیا کہ شام گیا۔ آج تو کچھ اس زور سے دھڑک رہا ہے کہ پسلیوں پر اس کی دستک صاف سنائی دے رہی ہے۔" غالب کا انداز اپناتے ہوئے کہتے "میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔" فقدانِ راحت کا سبب مادی نہیں روحانی تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے فضلی کی لاابالی طبیعت سے خائف رہتے۔ کہتے یہ کم بخت میری آنکھیں بند ہوتے ہی کتابوں سے گلوخلاصی کرا لے گا۔ اپنے سے بڑی عمر کی فلاں عورت سے شادی کرے گا۔ اور میری زمینوں کے منیجر کو نوکری سے فارغ کر دے گا۔ یہ دو باتیں گزشتہ پندرہ برس سے نہ صرف انہیں بے چین اور بے کل کیے ہوئے تھیں بلکہ مرتے بھی نہ دیتی تھیں۔ ہر سال کسی نہ کسی طرح ملک الموت سے ایکسٹینشن لے لیتے۔

ان سے آخری ملاقات ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ وزیر مال شوکت داؤد کا والد فوت ہو گیا تھا۔ میں ان دنوں بہاول پور میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ جنازے کے بعد انہیں ملنے گیا تو کافی کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی مکہ معظمہ میں حج کے دوران وفات پا گئیں۔ فضلی نے ان کی پیشین گوئی کے عین مطابق اپنے سے خاصی بڑی عورت سے شادی کر لی تھی۔ میں نے رسماً خیریت پوچھی تو ان کے لبوں پر ایک سوگوار مسکراہٹ اُبھری اور ٹوٹے ہوئے لفظوں میں غالب کا شعر پڑھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

ان کی حالت دیکھ کر مجھے بھی پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سرآمد روزگارے ایں فقیرے۔ چند گھنٹوں کے بعد میں نے اجازت چاہی تو بولے "ہرگز نہیں! بغیر کھانا کھائے آپ واپس نہیں جا سکتے۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے ملنے ضرور آؤ گے۔ میں نے پہلے سے ہی کھانا پکوا رکھا ہے۔"

میں بہاول پور میں ہی تھا خبر آئی کہ میر صاحب رحلت فرما گئے ہیں۔ فاتحہ کے لئے گیا تو دل بھر آیا۔ مکان تو وہی تھا صاحب دل مکین رخصت ہو گیا تھا۔ فضلی کو وراثت میں جائیداد تو مل گئی تھی لیکن باپ کے علم، حلم اور فہم و فراست سے محروم رہا۔ مکان میں کتابوں کی جگہ قالین کرسیاں اور صوفے بچھ گئے تھے۔ کورے گھڑے کی جگہ واٹر کولر نصب ہو گئے۔ کھڑکھڑ کرتے ہوئے بجلی کے پرانے پنکھے کی جگہ ایئر کنڈیشنر لگ گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

خواجہ خانپور: خواجہ ادریس کا تعلق خانپور شریف سے ہے۔ غالباً مولانا عبداللہ

درخواستی کی رہائش کی وجہ سے خانپور کے ساتھ شرافت کی اضافت لگائی گئی ہے وگرنہ اس شہر کی شہرت کچھ اتنی اچھی نہیں ہے۔ اس کے متعلق جو من جملہ لطائف مشہور ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت ابلیس نے اپنا مکروہ دھندا اسی شہر سے شروع کیا تھا۔ یہیں وہ پل بڑھ کر جوان بھی ہوا۔ اس منفی پروپیگنڈے کو ہوا دینے میں لیاقت پور کا بڑا ہاتھ ہے۔ دراصل دونوں تحصیلوں میں ایک طویل عرصہ سے رقابت چلی آ رہی ہے۔ دونوں ضلعے بننے کے خواہشمند ہیں۔ ایک بوڑھے کسان نے عوامی جلسے میں بھٹو صاحب کو جوتا بھی اسی شہر میں دکھایا تھا۔ بھٹو جارج بش کی طرح ڈفر نہیں تھا۔ زیرک انسان تھا فوراً بھانپ گیا کہ وہ حضرت ابلیس کی جنم بھومی میں کھڑا تقریر کر رہا ہے۔ ایک سیکنڈ کی تاخیر کیے بغیر بولا "بابا بیٹھ جاؤ! میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ واقعی ملک میں جوتے بہت مہنگے ہو چکے ہیں۔ میں اپنی پہلی فرصت میں نہ صرف سستے جوتے فراہم کروں گا بلکہ تمہیں بھی ایک جوڑا بھجواؤں گا۔" تالیوں کے شور میں بوڑھے دیہاتی کا غصہ دب گیا۔

دراصل خانپور کے لوگ بہت زیرک، نسبتاً پڑھے لکھے اور کافی حد تک چالاک ہیں۔ آنے والے کل کو پہلے سے بھانپ لیتے ہیں اور اپنے حقوق کے معاملے میں کوئی رو رعایت نہیں کرتے۔ ان کی انہی خوبیوں کو دشمن غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

خواجہ اور لیس شہر میں خان پور کے پیڑوں کی طرح مشہور ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ یہ حاجی سیف اللہ کی خانپوری ورژن ہے۔ چھوٹا قد لیکن سوچ بڑی ہے۔ فہم و ادراک کے مالک اس شخص میں زبان و بیان کی بڑی خوبیاں ہیں۔ ہزاروں کے مجمعے کو ہنسا بھی سکتا ہے، رُلا بھی سکتا ہے اور مشتعل کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہے۔ اس لئے الیکشن میں ہر اُمیدوار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب اس کے حق میں تقریر فرمائیں۔ خواجہ سارا سال سیٹھ اسلم کو رگیدتا ہے لیکن الیکشن کے وقت اُس کی پشت کے پیچھے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی یار لوگ کئی تحویلیں نکالتے ہیں لیکن نتیجتاً سیٹھ اسلم جیت جاتا ہے۔ علاقے میں مشہور ہے کہ جس شخص سے خدا ناراض ہو اس کے خلاف پراپیگنڈہ خواجہ اور لیس کرتا ہے۔ خواجہ پیشے کے اعتبار سے وکیل ہے۔ مسلکاً دیوبندی لیکن مزاجاً یاروں کا یار ہے۔ ادبی ذوق کے علاوہ اُس کی حسِ مزاح بہت تیز ہے۔

ایک کشتی دو سوار: انعام الرحمٰن سحری کی کتاب کی تقریب تو بہت کامیاب رہی لیکن اسے زیادہ دیر ٹھہرنا نصیب نہ ہوا۔ بدقسمتی سے سحری اور اصغر کریجہ ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ بہاولپور کی ایک ممبر اسمبلی کو یہ دل کے ساتھ دماغ بھی دے بیٹھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اصغر کریجہ میاں نواز شریف کا منہ چڑھا ایم پی اے ہے۔ سحری اس سے

سینگ پھنسا بیٹھا۔ نتیجتاً کریجہ نے اسے تبدیل کروا دیا۔ اکثر لوگ حیران ہوتے کہ ڈھلتی ہوئی عمر کی اس خاتون میں انہیں کیا نظر آیا ہے۔ اصغر کی سنجیدگی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اسمبلی میں اس نے سیٹھ اسلم کو اس سے میٹھی باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہاں تک تو معاملہ شاید قابل برداشت تھا لیکن جب سیٹھ اسے اپنی بیجرو میں بٹھا کر گھر چھوڑنے گیا تو کوریجہ کا ناریل پھٹ گیا۔ اگلے دن اس نے پہلے تو محترمہ کی کلاس لی اور پھر اسے کہا کہ وہ سیٹھ اسلم کو بھائی صاحب کہہ کر سب کے سامنے مخاطب کرے۔ چنانچہ اس نے جب سیٹھ اسلم کو بھائی جان کہا تو سیٹھ غصے سے بپھر گیا۔ خوب گالم گلوچ ہوئی۔ وہ عورت بھی کب پیچھے رہنے والی تھی۔ بولی "لالے! اب اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہیں فلائنگ کک ماروں گی۔" حاضرین کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا اور سیٹھ دم دبا کر بھاگ گیا۔ اس قدر بھاری بھرکم عورت کی لات کھانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

شیخ زید بن سلطان النہان: رحیم یار خان کی شہرت کی وجہ ہر سال شیخ زید بن سلطان النہان کی آمد بھی تھی۔ نہ جانے کس طرح سارے ملک میں مشہور ہو گیا تھا کہ ابوظہبی کا حکمران وہاں آ کر شکار کم کھیلتا ہے اور داد عیش زیادہ دیتا ہے۔

میں جب رحیم یار خان جا رہا تھا تو میری ملاقات سروسز انڈسٹری کے احمد سعید صاحب سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں ان افواہوں کا ذکر چھڑا تو بولے "یہ سب قصے کہانیاں ہیں اس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وہاں پہنچ کر ان کی بات کی جلد ہی تصدیق ہو گئی۔ نومبر سے جنوری تک شکار کا سیزن ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان نے ابوظہبی کے لئے شکارگاہ کا رقبہ مختص کر رکھا ہے۔ وہاں کسی اور عرب حکمران کو شکار کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح دوبئی کے حکمرانوں کے لئے بہاولپور ضلع میں اور سعودی شہزادوں کے لئے بہاولنگر میں شکار گاہیں بنائی گئی ہیں لیکن جس طمطراق اور سج دھج سے رحیم یار خان میں شکار ہوتا ہے وہ باقی شکار گاہوں میں ممکن نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوبئی کے حکمران ٹریڈرز زیادہ اور منعم کم ہیں۔ ایک تاجر پائی پائی کا حساب رکھتا ہے۔ اسی طرح سعودی شہزادے بھی طبعاً کم خرچ کرتے ہیں۔ ان کے برعکس شیخ زید کا دل اور دسترخوان دونوں بہت وسیع ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ کوئی عرب شکاری بندوق کا استعمال نہیں کرتا۔ صحرا میں بارود کی بو نہیں پھیلتی۔ شکار کے لئے باز استعمال کرتے ہیں۔ سائبیریا میں جب برف باری شروع ہوتی ہے تو پرندے گرم علاقوں کا رُخ کرتے ہیں۔ نقل مکانی کرنے والے پرندگان میں تلور اور سارس زیادہ مشہور ہیں۔ سارس اور

مرغابیاں تو دریاؤں اور جھیلوں کا رخ کرتی ہیں لیکن تلور صحراؤں میں قیام کرتے ہیں۔ یہ قافلوں کی شکل میں سفر کرتے ہیں۔ برسہا برس سے متعین راستوں پر ان کی پرواز ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کمرشل ایئرلائن کا کوئی جہاز IATA کے مقرر کردہ راستے سے بھٹک جائے لیکن ان پرندوں کے اندر نصب قدرت کا کمپیوٹر انہیں سرمو بھی ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا۔ قیام گاہیں بھی طے شدہ ہوتی ہیں۔ ان پرندوں کا سردار بھی ہوتا ہے جس کی کمان میں منزلیں طے کرتے ہیں۔

تلور جسے انگریزی میں Hobara Bustard کہا جاتا ہے مرغ سے قریباً دو گنا بڑا پرندہ ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مسلسل کھانے سے قوت باہ تیز ہوتی ہے۔ عرب حکمرانوں کی آمد کا واحد مقصد اس نایاب پرندے کا شکار ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں لیکن اصل مزہ اس کے گوشت میں نہیں بلکہ شکار میں ہے۔ جب شکرا اس کا تعاقب کرتا ہے اور In one fell swoop اپنے تیز پنجے اس کی گردن پر گاڑ کر اسے دبوچتا ہے تو حظ اُٹھانے کا وہ منظر حاصل شکار ہے۔ شکاری کے آنے تک وہ اسے ریت پر لٹائے رکھتا ہے۔

عربوں کی آمد سے پہلے ہر چہ بادا باد تھا۔ شکاری ایک نہیں بسا اوقات بیس بیس ہرن مار کر لے جاتے۔ تلوروں کا بھی اس قدر قلع قمع کرتے کہ واپس سائبیریا جانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ پھر Poaching اور Netting والی پارٹیاں الگ تھیں۔ ان کا سرخیل رائے احمد علی تھا۔ وہ پابندی کے باوجود باز نہ آتا۔ اس مکروہ کاروبار کے لئے اس نے سارے چولستان میں کارندے رکھے ہوئے تھے۔ فی تلور تین سو روپے میں خرید کر خلیجی ریاستوں میں دس ہزار میں بیچتا۔ جو عرب سردار یہاں نہ آسکتے وہ اپنے علاقے میں ہی محدود پیمانے پر شکار کا ٹھرک جھاڑ لیتے۔ ایک مرتبہ ہمیں مخبر نے اطلاع دی کہ رائے احمد علی نے شہر سے باہر ایک مکان میں تلور جمع کر رکھے ہیں اور عنقریب اس ملک سے باہر سمگل کرنے والا ہے۔ میں نے پولیس کی معیت میں جب ریڈ کیا تو مکان کا ہر کمرہ زندہ تلوروں سے بھرا پایا۔ رائے احمد علی دوڑ گیا لیکن اس کے ملازم پکڑے گئے جنہوں نے حسب توقع سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ ہم نے اس کی اطلاع میاں نواز شریف کو دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ تین سو تلور محل کو تحفتاً دے دیے جائیں۔ انہیں یہ سمجھانا کہ ایسا کرنا بھی غیر قانونی فعل ہے، بیکار تھا۔ ہم نے پیلس منیجر خورشید کو اطلاع دی۔ چند گھنٹے بعد ہی جواب آ گیا شیخ زید نے وزیراعلیٰ کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ یہ تجویز ضرور دی کہ پرندوں کو آزاد کر دیا جائے۔ میاں صاحب اس

Rebuke & Rebuff کو کہاں سمجھنے والے تھے۔ ارشاد فرمایا ''پرندوں کو محل سے ملحقہ صحرا میں چھوڑا جائے۔'' یہ کارروائی محل کے منیجر کی نگرانی میں کی جائے اور اس کی ویڈیو فلم بنا کر انہیں بھجوائی جائے۔ نئے کمشنر ملک عبدالمجید کو پتہ چلا تو بولے کہ دس بارہ تلور چپکے سے نکال کر انہیں بھجوا دیے جائیں۔ میں نے انہیں بمشکل سمجھایا کہ یہ ایک طرح کی خیانت ہوگی۔ پھر وزیر اعلیٰ کو پتہ چل گیا تو ہم سب کی شامت آ جائے گی۔ شامت والی بات وہ فوراً سمجھ گئے۔ ان کی سروس کا بھی آخری سال تھا۔ بڑی مشکل، منتوں اور ترلوں کے بعد کمشنری کا بٹیر ہاتھ آیا تھا۔ وہ اسے کیسے جانے دیتے۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر صرف اتنا کہا ''میں نے سنا ہے کہ اس کا گوشت کھانے سے فیوز شدہ بلب بھی جل اُٹھتے ہیں۔ یہ یونانی دواخانے تو بس نام کے رہ گئے ہیں۔

محکمہ وائلڈ لائف کو مبلغ پندرہ ہزار روپے فی شکار شدہ پرندہ ادائیگی کی جاتی ہے۔ گویا جو پرندہ ابوظہبی میں زندہ دس ہزار کا بکتا تھا اس کی پاکستان میں سرکاری قیمت پندرہ ہزار تھی۔ پلیس منیجر نے بتایا کہ اگر دیگر اخراجات بھی شامل کر لئے جائیں تو پھر عرب شیخوں کو ایک تلور تین لاکھ میں پڑتا ہے۔ ان پرندوں کے لئے ہزہائی نس نے دو ہسپتال بھی بنوا رکھے ہیں۔ جہاں ہر سال تین سو پرندوں کا علاج کر کے انہیں آزاد کر دیا جاتا ہے۔

اطلاع آئی کہ شیخ زید شکار کے لئے آ رہے ہیں۔ ہمیں تیاری کے لئے پندرہ دن ملے۔ اس عرصے میں میں نے شیخ زید کے متعلق جو معلومات اکٹھی کیں وہ حیران کن تھیں۔ شیخ زید ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ سلطان بن زید تھے۔ اپنے چار بھائیوں میں یہ سب سے چھوٹا تھا۔ اس وقت کا ابوظہبی آج کی ریاست سے قطعاً مختلف تھا۔ غربت، افلاس اور بے بسی نے چار سو ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بارش کی کمی کی وجہ سے لوگ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سارا سال آسمان کی طرف دیکھتے رہتے۔ زراعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کوئی انڈسٹری نہیں تھی۔ ذرائع آمدن محدود ہی نہیں عملاً مفقود تھے۔ مچھلی اور موتیوں کی تجارت سے لوگ بمشکل ایک وقت کا کھانا کھا سکتے تھے۔ شاہی خاندان بھی ہر وقت تنگ دست رہتا۔ پورے شہر میں کوئی پکی سڑک نہیں تھی۔ کوئی سکول یا ہسپتال نہ تھا۔ بیماری جب بھی آتی تو موت کا پروانہ ساتھ لاتی۔ برطانیہ نے اس صورت حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۱۸۹۲ء میں خلیجی ریاستوں سے معاہدہ کر لیا۔ معاہدے کی رُو سے ان کی خارجہ پالیسی برطانیہ کو سونپ دی گئی لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ یہ ریاستیں پڑوسی ملکوں کی یلغار سے بچ گئیں۔ کہتے ہیں مصیبتیں اکیلی نہیں آتیں۔ ۱۹۲۶ء میں شیخ زید کے والد شیخ سلطان کو اس کے

بھائی شیخ سقر نے قتل کر دیا۔ وہ ان چار بھائیوں کا بھی گھونٹ بھرنا چاہتا تھا لیکن یہ کسی طور بچ نکلے۔ اس نے ان کا تعاقب جاری رکھا۔ یہ کبھی غاروں میں چھپتے، کبھی پڑوسی ملکوں کی پناہ میں رہتے ہوئے کسی طور بچ گئے۔ ۱۹۲۸ء میں شیخ سقر بھی قتل ہو گیا۔ اس کے بعد شیخ زید کا بڑا بھائی شیخ شکبت گدی پر بیٹھا۔ اس نے چالیس سال برائے نام حکومت کی۔ چونکہ قدامت پسند شخص تھا اس لئے ریاست نے کوئی خاص ترقی نہ کی۔ اس نے شیخ زید کو العین کا گورنر مقرر کیا۔ اس وقت زید کی عمر تیس سال کی تھی۔ جس شخص نے موت کو قریب سے دیکھا ہو، غربت اور افلاس کی زندگی گزاری ہو، تپتی ہوئی ریت پر پاپیادہ چل کر آبلہ پا ہوا ہو، بادِ صرصر اور بادِ صموم کے تھپیڑے کھائے ہوں اپنوں کا زخم خوردہ ہو اور غیروں کے رحم و کرم پر زندہ رہا ہو اسے رازِ حیات جاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ گورنر بننے کے بعد شیخ زید نے امریکہ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ ان دوروں نے نہ صرف وسعتِ نظر دی بلکہ اس نے محسوس کیا کہ تبدیلی کا وقت آن پہنچا ہے اور ابوظہبی کو بھی اپنے طور طریقوں کو بدلنا ہوگا۔ نہیں تو اقوامِ عالم کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔ اس نے اپنے حاکم بھائی کو بہت سمجھایا لیکن ایک ان پڑھ بدو سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود میں رہا۔ وہ کسی حالت میں بھی بدوؤں کے طور طریقے چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ ان دنوں تیل بھی نکل آیا تھا۔ شیخ زید چاہتا تھا کہ خوش حالی کا فائدہ ساری قوم کو پہنچے۔ وہ جب اپنے ماضی میں جھانکتا تھا تو اسے اپنے لوگوں پر مزید ترس آتا تھا جو اس وقت تک زندگی کی ہر نعمت سے محروم تھے۔

جب النہیان خاندان نے دیکھا کہ ترقی کا ہر راستہ مسدود ہوتا جا رہا ہے اور "گل محمد جلبد" کے لئے تیار نہیں ہے تو اس نے شیخ شکبت کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ تھوڑی بہت رد و کد کے بعد وہ اقتدار شیخ زید کو سونپنے پر تیار ہو گیا۔ ۶ اگست ۱۹۶۶ء کو شیخ زید نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی ابوظہبی کو بتدریج فلاحی مملکت بنانے کا اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سکول، ہسپتال، سڑکیں، ٹریڈ سنٹر اور بلند و بالا عمارات کھڑی ہو گئیں۔ تیل کی آمدن بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔

برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ۱۹۷۱ء تک گلف سے نکل جائے گا۔ شیخ زید کی دُوررس نظروں نے پہلے سے ہی ایک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس نے فوراً ہی دوبئی سے رابطہ کیا اور اس طرح دسمبر ۱۹۷۱ء میں سات ریاستوں کا الحاق ہو گیا اور اسے متحدہ عرب امارات کا نام دیا گیا۔ اس اتحاد میں ابوظہبی، دوبئی، شارجہ، راس الخیمہ کے علاوہ ام القیوا فجیرہ، قطر اور بحرین کو بھی دعوت دی گئی لیکن ان کے حکمرانوں نے معذرت کر لی۔

[جاری ہے۔]

آہ! ڈاکٹر اجمل نیازی

پچھلا سال اُردو ادب پر نہایت گراں گزرا ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس دوران کئی اہلِ قلم کی دنیا سے چلے جانے کی خبریں ملتی رہیں۔ جو اس جہانِ رنگ و بو میں آیا ہے، آخر اسے اک نہ اک دن یہاں سے عدم کو لوٹنا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی اموات اتنی غیر یقینی اور تکلیف دہ ہوتی ہیں کہ مدتوں آدمی صدمے کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس جہاں کے لیے کوئی ناگزیر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، مگر ایسے لوگ جنھیں قدرت بڑے کاموں کے لیے منتخب کرتی ہے، ان کا درمیان میں سے اُٹھ جانا جہاں ان کے خاندانوں کے لیے محرومی کا باعث بنتا ہے وہاں ان سے محبت کرنے والے بھی لحظہ لحظہ ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

ہندوستان کے شمس الرحمٰن فاروقی اور شمیم حنفی اردو ادب کے بہت بڑے نام تھے کورونا کی زد میں آ گئے۔ پہلے شمس الرحمٰن فاروقی پچھلے سال دسمبر کے آخری دنوں میں داغ مفارقت دے گئے، پھر چند ماہ بعد شمیم حنفی بھی ان کے پیچھے چلتے ہوئے موت کی وادیوں میں اُتر گئے۔ یہ دونوں احباب ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن پاکستان ان کا دوسرا وطن تھا۔ ان کی کتابیں وطن عزیز میں بہت مقبول ہیں اور نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ممتاز ادیب اور بیوروکریٹ مسعود مفتی اور ڈاکٹر صفدر محمود، افسانہ نگار رشید امجد، مسعود اشعر، شاعر شفیق سلیمی، نجیب احمد اور ڈاکٹر ابرار احمد بھی پیوند خاک ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جنھوں نے پاکستان کو جوہری طاقت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ادیب بھی تھے اور نہایت اعلیٰ پائے کے سخن فہم اور وسیع المطالعہ شخصیت تھے وہ بھی گزر گئے۔

ابھی ان نابغہ روزگار شخصیات کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ لاہور سے ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کی وفات کی خبر بھی آ گئی۔ آنکھوں کے پردوں پر ماضی کی کئی انمول تصویریں رہ رہ کے لہرانے لگیں، وہ پچھلے چند مہینوں سے بے حد علیل تھے۔ اسی دوران وہ غسل خانے میں گر پڑے جس سے

ہارون الرشید

ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی، بیچارے چارپائی سے لگ گئے ایک ڈر سا لگا رہتا تھا ایسا نہ ہو کہ یہ بھی کہیں جدائی کے صدمے سے دو چار کر جائیں لیکن ہوتا وہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی منشا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی سے یاد اللہ نوے کی دہائی سے تھی۔ میں ان دنوں شمالی علاقہ کے مرکزی شہر گلگت میں مقیم تھا۔ چونکہ میرا تعلق بھی شعر و ادب سے ہے، کئی تخلیق کاروں سے میرے ذاتی تعلقات ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی اس زمانے میں روزنامہ پاکستان کے ادبی صفحے کے انچارج تھے، ان سے رابطہ ہوا تو پھر خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ انھوں نے روزنامہ پاکستان کے ادبی صفحہ میں میرا انٹرویو شائع کیا۔ پھر انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انھیں ادبی صفحے کے لیے شمالی علاقوں کے خوبصورت اور دیدہ زیب مناظر کی تصاویر اشاعت کے لیے ارسال کروں۔ میں نے انھیں بعض بڑی نایاب تصاویر بھیجیں جو بعد میں ادبی صفحے کی زینت بنتی رہیں۔ انہی دنوں حلقہ ارباب ذوق گلگت کا شمالی علاقوں کے نمایاں شعرا کی شاعری کا انتخاب۔ ''شمالی علاقہ جات کا اردو ادب'' کے نام سے شائع ہوا جسے ادبی حلقوں میں بڑی پزیرائی ملی۔

میں نے اس انتخاب کا ایک نسخہ ڈاکٹر اجمل نیازی کو بھی ارسال کر دیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور نہایت مسرت بھی کہ انھوں نے اس مجموعے پر نہایت عمدہ اور مفصل مضمون تحریر کیا اور اس کے لیے روزنامہ پاکستان کے ادبی صفحے کا آدھا صفحہ مختص کیا۔ انھوں اپنے مضمون میں اس مجموعے میں شامل شعرا کی شاعری کے معیار کی نہ صرف تعریف کی بلکہ پاکستان ٹیلی ویژن سے مطالبہ کیا کہ ان شعرائے کرام کو پی ٹی وی پر بلا کر ان کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جائے۔ خیر شمالی علاقوں کے شعرا کو پی ٹی وی والوں نے کب بلانا تھا۔ یہ کام تو آج تک نہیں ہو سکا۔ لیکن میرے دل میں ان کی عزت اور بڑھ گئی۔ مجھے احساس ہوا اور آج بھی ہے کہ وہ انتہائی مہربان شخصیت تھے۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا رنج رہتا ہے کہ درمیان میں اتنا طویل عرصہ گزرا، لیکن ان سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر اجمل نیازی بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ میانوالی کے ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے۔ حسن اتفاق سے قیام پاکستان کا دن ان کا یوم ولادت بھی ہے۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی بطور اردو استاد کے گزری، ہزاروں طلبا کو اردو ادب پڑھایا۔ محمد دین فوق پر تھیسس لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ طویل عرصے تک اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔ وہ اپنے کالموں میں مذہبی، تہذیبی اور مشرقی اقدار کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ پاکستانیت ان کے رگ و پے میں دوڑتی تھی۔ اخبارات میں تقریباً سارے کالم ہی سیاسی موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن وہ سیاسی موضوعات پر بھی لکھتے ہوئے اپنے کالم میں ادبی رنگ اتار دیتے تھے وہ اپنی تحریر میں عمدہ اشعار کا بھی نہایت برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان کی نثر

سادہ لیکن فنی پرکاری سے مملو ہوتی تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے، لیکن وہ شاعری کو زیادہ وقت نہیں دے سکے اگر وہ اس پر زیادہ توجہ مرکوز کرتے تو اور بلند مقام پر ہوتے لیکن اس کے باوجود ان کا جو شعری ورثہ ہے وہ اردو ادب کا فخر رہے گا۔ اجمل نیازی نامور شاعر منیر نیازی کے بڑے عاشق تھے۔ وہ اکثر اپنے کالموں مضامین اور ادبی تقاریب میں ان کا نہایت عقیدت اور محبت سے ذکر کرتے تھے اور نیازی قبیلے کا خان اعظم کہتے تھے اور اس میں شک بھی کیا ہے۔

اجمل نیازی کی دو کتابیں نہایت اہم ہیں، ایک ''مندر میں محراب'' اور دوسری ''بازگشت''۔

''مندر میں محراب'' ہندوستان کا سفرنامہ جس میں انھوں نے ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے ہندوستان کی تہذیب اور ہندو معاشرے کو بغور دیکھا ہے اور نہایت غیر جانبدار تجزیہ کیا ہے اس میں بعض ابواب نہایت اہمیت کے حامل ہیں اس میں انھوں نے ہندوؤں کی مسلمانوں سے گہری نفرت کا نہایت خوبی سے پردہ چاک کیا ہے اور مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی نشاندہی کی ہے۔ آج ہندوستان میں مسلمان جس عذاب سے گزر رہے ہیں وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ ہندتوا کا جن بوتل سے باہر آچکا ہے جس نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ اس کتاب کے بعض مضامین بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

''بازگشت'' ان کے وطن مالوف میانوالی کے شعرائے کرام پر لکھے گئے ان کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں ان کے کلام کا کچھ انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ ''بازگشت'' میں تمام شعرا پر ان کے تحریر کردہ مضامین نہایت دلچسپ ہیں جن میں بعض پرانے اور بزرگ شعرا پر ان کے لکھے ہوئے مضامین خاصے کی چیز ہیں۔ اس کتاب کا پہلا مضمون میانوالی کے علاقے عیسیٰ خیل سے تعلق رکھنے والے ہندو شاعر منشی تلوک چند محروم کے بارے میں ہے۔ یہ طویل مضمون پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر اجمل نیازی نے ان کے فن اور بالخصوص شخصیت کو جس انہماک کے ساتھ اور ڈوب کر لکھا ہے، قاری کی آنکھیں بھگو دیتا ہے۔ منشی تلوک چند محروم اردو شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے۔ مشہور شاعر اور ادیب جگن ناتھ آزاد ان کے بیٹے ہیں۔

اجمل نیازی نے زندگی کا طویل عرصہ لاہور میں گزارا اور یہیں زندگی کی آخری سانسیں لیں، مال و منال کی ہوس سے دور رہے اس لیے عزت پائی۔ پانچ مرلے کے ایک سادہ مکان میں عمر گزری، ہمیشہ قومی لباس پہنتے تھے اور سر پر مخصوص دھاری دار پگڑی باندھتے تھے۔ ان کا تخلیقی کام انھیں تادیر زندہ رکھے گا۔ وہ دنیا سے جا چکے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ میری زندگی کی خوبصورت یادوں میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین اور خاندان کو یہ دکھ سہنے کی ہمت اور حوصلہ دے۔

ہوئی ہے شام مگر بھیڑ میں کھڑا ہوں ابھی
وہ کب کا ہاتھ ہلاتے ہوئے گزر گیا ہے

☆☆☆☆☆

بُلبُلِ پاکستان، بشریٰ رحمٰن

یہ عجب اتفاق ہے کہ جس روز بلبلِ ہندوستان لتا منگیشکر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوئیں عین اس کے اگلے دن ہمارے چمن رازِ سیاست کی بُلبُل بشریٰ رحمٰن نے ابدی سکوت اختیار کرلیا۔ ہمارے اہلِ سیاست نے پچھلی چند دہائیوں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے وہ اسلوبِ گفتگو اختیار کرلیا ہے، جس نے شرافت اور متانت کو منہ چھپانے پر مجبور کردیا ہے۔ حلقہ بگوشیانِ ادب، پنبہ بگوش رہنے پر مجبور ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے سیاست میں قدم رکھا، تو انھوں نے پنجاب اسمبلی میں اپنے دل نشیں لہجے کی انفرادیت کو یوں تسلیم کرایا کہ انھیں سرکاری طور پر ''بُلبُلِ پنجاب'' کا خطاب عطا کردیا گیا۔ اس اعزاز کی سرکاری سند اسمبلی کی دیوار پر آویزاں کی گئی۔ سچ یہ ہے کہ وہ بُلبُلِ پاکستان تھیں۔ سارا پاکستان ان کے دل نشیں لہجے کا قتیل تھا۔ ہمارے اہلِ سیاست نے لڑائی جھگڑے اور مفادات کی سیاست میں اخلاقیات کو یوں بالائے طاق رکھ دیا تھا کہ شاعر کو کہنا پڑا:

بہت حسین ہے ، اسلوبِ طعنہ و دشنام
کہاں سے شہر میں یہ خوش کلام آئے ہیں

.....

بشریٰ رحمٰن کسی تقریب میں خطاب کر رہی ہوتیں یا دوستوں کے حلقے میں محوِ گفتگو ہوتیں تو ہر شخص ہمہ تن گوش ہوتا۔ ایک تو ان کا لہجہ دل کش تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ الفاظ کا چناؤ بہت احتیاط سے کرتی تھیں۔ بولتیں تو یوں لگتا تھا جیسے گنگناتی ہوئی کوئی ندی رواں ہے۔ دل کے شفاف چشمے سے، نئے

ناصر بشیر

نوکیلے اور اَن چھوئے میٹھے الفاظ، پھوٹتے اور سیدھے دل پر دستک دیتے۔ اُن کی شرکت کسی بھی تقریب کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ ادب کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں تھا زندگی کا قرینہ بھی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسلام آباد اکادمی ادبیات پاکستان کی ایک کانفرنس تھی۔ میں، یونس جاوید اور بشریٰ آپا ہوٹل کے ایک گوشے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے بلکہ یوں کہیے کہ ہم دونوں بشریٰ آپا کی گُل افشانیٔ گفتار سے محظوظ ہو رہے تھے۔ جنوبی پنجاب سے آئے ہوئے ایک ممتاز شاعر کچھ دور کھڑے ان کی باتیں سُن رہے تھے۔ ان کی جو شامت آئی تو وہ کچھ آگے بڑھے اور بشریٰ آپا کو ٹوک کر اپنی بات شروع کر دی۔

تب بشریٰ آپا کا جلال دیکھنے والا تھا۔ انھوں نے اپنی انگشتِ شہادت اس شاعر کے چہرے کے سامنے ایستادہ کر کے کہا: ''اے صاحب! آپ کون ذات شریف ہیں؟ آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ جب کوئی شخص کسی سے مخاطب ہو تو بیچ میں ٹوکا نہیں کرتے۔ دخل در معقولات کی آپ کو کس نے اجازت دی؟'' وہ صاحب اچھے خاصے معزز آدمی تھے۔ بشریٰ آپا کی سرزنش پر جھینپ کر رہ گئے۔ معافی کے خواست گار ہوئے۔ بشریٰ آپا نے اُن کی معافی قبول کی۔ وہ صاحب وہاں سے جانے لگے تو بولیں: ''نہیں اب آپ کی سزا ہے کہ آپ یہیں چپ چاپ کھڑے رہیں گے اور پوری بات سنیں گے۔'' جب بشریٰ آپا اپنی بات مکمل کر چکیں تو ان صاحب کو مخاطب کر کے بولیں: ''اچھا تو اب کہیے: آپ کیا کہہ رہے تھے؟''

یہ تھا ان کا قرینہ۔ ہم جیسے بہت سوں نے اُن سے یہ قرینہ سیکھا۔ اس کانفرنس سے بس میں واپس آتے ہوئے، مجھے بشریٰ آپا کے ساتھ والی نشست ملی۔ ابتدائے سفر میں تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد بشریٰ آپا نے اپنے ہینڈ بیگ سے جیبی سائز کی ایک کتاب نکالی اور پڑھنا شروع کر دی۔ یہ کتاب شاہ عبداللطیف بھٹائی کے افکارِ عالیہ کا مجموعہ تھا۔ لاہور پہنچے تو میں نے دیکھا کہ یہ نہایت عمدہ اور بہترین کتاب بشریٰ آپا کی نشست کے نیچے پڑی تھی اور وہ خود بس سے اُتر کر جلدی سے اپنے ڈرائیور کے ساتھ گھر روانہ ہو چکی تھیں۔ میں نے وہ کتاب اٹھالی۔ گھر پہنچ کر فون پر انھیں ان کی کتاب سے متعلق بتایا تو حکم دیا کہ کتاب لے کر ابھی گھر پہنچو۔ ظاہر ہے کہ سرتابی کی مجال نہ تھی۔

ایک بار میں نے بشریٰ آپا سے ایک انٹرویو میں پوچھا تھا کہ لاہور میں پہلا افسانہ انھوں نے کہاں سنایا تھا؟ میرا خیال تھا کہ وہ حلقہ ارباب ذوق کا ذکر کریں گی لیکن انھوں نے کچھ اور ہی بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ ستر کی دہائی کے شروع میں وہ لڑکوں کے ایک تعلیمی ادارے گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں منعقد ہونے والے افسانہ نگاری کے ایک مقابلے میں شریک ہوئی تھیں انتظار حسین اور ناصر کاظمی منصف تھے جب تک میں افسانہ پڑھتی رہی، ناصر کاظمی سگریٹ پر سگریٹ پیتے رہے اور دُھواں اُڑاتے رہے۔ جب میں نے بشریٰ آپا سے یہ انٹرویو کیا تھا، تب میں اسی کالج میں لیکچرار تھا اور نوجوان ادیبوں، شاعروں کی تربیت کے لیے قائم کیے گئے ینگ رائٹرز کلب کا انچارج تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کو چار دہائیاں پیچھے لے جاؤں گا اور نوجوان ادیبوں کے روبرو کھڑا کروں گا۔ لیکن ایک مسئلہ یہ تھا کہ اس کالج میں ایک مذہبی سیاسی جماعت کی ذیلی تنظیم خواتین کو آنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ پرنسپل صاحب نے کئی اندیشے میرے سامنے رکھے تاکہ میں یہ تقریب منسوخ کر دوں۔ جب میں نے بشریٰ آپا کے سامنے یہ صورت حال رکھی تو وہ بولیں: ''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں وہاں ضرور آؤں گی اور دیکھوں گی کہ کون مجھے روکتا ہے؟''

تقریب کا دن مقرر ہو گیا۔ بشریٰ رحمٰن تشریف لے آئیں اور انھوں نے خوب خطاب کیا واقعات سنائے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا، انھوں نے کہا، ''شادی سے پہلے ہم بہاول پور میں اباجی کے گھر میں رہا کرتے تھے۔ میرا اور میری بہن کا ایک ہی کمرا تھا۔ ہمارے گھر کا ایک ملازم ایک دن دروازہ کھٹکھٹائے بغیر ہمارے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، ''بے وقوفا'' لڑکیوں کے کمرے میں بغیر دستک دیے نہیں آیا کرتے''

بولا: ''بیگم صاحبہ! میں اتنا بھی بے وقوف نہیں، کمرے میں آنے سے پہلے میں نے چابی والی موری سے جھاتی ماری تھی۔'' بچے یہ واقعہ سن کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

آپا کو میں نے اسٹیج پر بُلایا تو وہ یوں گویا ہوئیں: ''میرے بیٹو! میں تمھاری ماں ہوں۔ تمھاری ایک ماں وہ ہے جس نے صبح سویرے تمھیں سجا سنوار کر کالج بھیجا ہے۔ یہ کالج بھی تمھاری ماں کی طرح ہے۔ یہ ماں بھی تمھیں سجاتی اور سنوارتی ہے۔ میری طرف دیکھو! میں بھی آج تمھیں تمھاری ماں کی طرح سجانے اور

سنوارنے کے لیے یہاں خود آئی ہوں۔'' اپنی گفتگو کی ابتدا ہی میں انھوں نے ہال میں موجود تمام بچوں کو اپنے دل نشیں طرزِ بیان کے زور پر یوں اپنے زیرِ اثر کیا کہ وہ ''بشریٰ رحمٰن زندہ باد'' ''بشریٰ رحمٰن زندہ باد'' کے نعرے لگانے لگے۔ اسی محفل میں انھوں نے یہ واقعہ بھی سنایا تھا:

یہ بات بھی نہایت عجیب ہے کہ بشریٰ رحمٰن جس خانوادے میں بیاہ کر آئیں اس کا تعلق آج بھی پاکستان مسلم لیگ نون سے ہے لیکن انھوں نے قومی سیاست، قاف لیگ کے پرچم تلے رہ کر کی۔ پنجاب اسمبلی کی طرح، قومی اسمبلی میں بھی انھوں نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ ان موضوعات پر بات کرتیں، جن کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا۔ ایک بار انھوں نے کالا باغ ڈیم کی حمایت میں آواز اُٹھائی۔ قومی اسمبلی میں اس موضوع پر انھوں نے مسلسل تقریریں کیں تو سندھ اور کے پی کے کی طرف سے ان کے خلاف نعرے بُلند ہونے لگے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا حوصلہ پست نہ ہوا۔

یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کے لائق ہے کہ 2010 میں لاہور کے ایک کالج کا لیکچرار اٹھارہویں گریڈ میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر پروموٹ ہوا تو محکمے نے اسے لاہور سے تقریباً ساٹھ ستر کلو میٹر دور واقع ایک کالج میں پوسٹنگ دے دی جبکہ خود اسی لیکچرار کے کالج میں اٹھارہویں گریڈ کی ایک سیٹ موجود تھی۔ اُسے وہیں رکھا جا سکتا تھا لیکن اس زمانے کے صوبائی وزیرِ تعلیم ایک اور شخص کو اس سیٹ پر پوسٹنگ دینا چاہتے تھے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس وزیرِ تعلیم کا تعلق، بشریٰ آپا کے سسرالی خاندان سے تھا۔ وہ ان کی مخالف پارٹی مسلم لیگ (ن) کا نمائندہ تھا۔ اس نوجوان نے بشریٰ آپا سے رابطہ کیا اور ساری صورت حال ان کے گوش گزار کی۔ بشریٰ آپا بولیں:

''تم حق پر ہو۔ اس پوسٹنگ پر تمھارا حق فائق ہے۔ میں آج ہی وزیرِ تعلیم سے ملوں گی اور انھیں حق پر مبنی فیصلہ کرنے کی ترغیب دوں گی۔'' اگلے دن اس نوجوان کو سیکرٹریٹ کے ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک سیکشن آفیسر کا فون آیا اور کہا کہ آ کر اپنے آرڈرز وصول کر لیں۔

یہ نوجوان آج بھی بشریٰ آپا کی حق نوازی کے گن گاتا ہے۔ میں ان کے جنازے میں شریک ہوا۔ میت کو کندھا دیا اور یہ سوچتا رہا کہ اچھے لوگ دنیا سے جلدی کیوں چلے جاتے ہیں؟

☆☆☆☆☆

بلبل پنجاب خاموش ہوگئی.....!!!

نامور ادیبہ، ناول نگار، افسانہ نگار، کالم نویس اور سابق ممبر قومی اسمبلی بشریٰ رحمٰن 7 فروری 2022 پیر کے روز انتقال کر گئیں۔ وہ مشرقی روایات کی امین تھیں۔ وہ 29 اگست 1944 کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بہاول پور سے حاصل کی اور جامعہ پنجاب سے ایم اے صحافت کیا۔ ان کے ناول اور ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ 1983 میں انہوں نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ وہ مجلس شوریٰ پنجاب کی رکن رہیں۔ ممبر قومی اسمبلی بھی منتخب ہوئیں۔ تحریر اور تقریر پر انہیں عبور حاصل تھا۔ اسمبلی میں وہ تقریر کرتیں تو حامی اور مخالف سب ان کے انداز بیاں کی تعریف کرتے اسی لیے انہیں ''بلبلِ پنجاب'' کا خطاب دیا گیا۔ اصل میں وہ ''بلبلِ پاکستان'' تھیں۔ وہ طویل عرصہ تک روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ''چادر، چاردیواری اور چاندنی'' کے عنوان سے کالم بھی لکھتی رہیں۔ آبروئے صحافت مجید نظامی نے انہیں ''دُخترِ پاکستان'' کا خطاب دیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دانشور تھیں۔ زوال پذیر اخلاقی قدروں پر وہ کڑھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ معاشرے کی خرابی میں مردوں سے زیادہ عورتوں کا ہاتھ ہے۔ شادی شدہ عورتیں اپنے شوہروں کو بلاوجہ شک اور تنقید سے گھریلو زندگی سے متنفر کرتی ہیں۔ ان کی

محمد شعیب مرزا

تحریروں اور تقریروں میں شگفتگی بھی ہوتی اور معاشرتی بے ضابطگیوں پر طنز بھی۔ سچی بات کہنے سے وہ جھجکتی نہیں تھیں۔ مٹھاس اور طنز میں گندھی ان کی گفتگو سامعین کو محظوظ بھی کرتی اور رہنمائی بھی۔

بشریٰ رحمٰن نے مختلف جہتوں میں کام کیا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری چند دنوں کے علاوہ مسلسل کام کرتی رہیں۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن اور پرائیویٹ پروڈکشن کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے۔ ان کے ناول اور افسانے بھی بہت مقبول ہوئے۔ ان کی ستر وکتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں چپ (افسانے) مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک مطالعہ خوبصورت (ناول) چاند سے نہ کھیلو، لازوال، دانا رسوئی، بہشت (افسانے)، صندل میں سانسیں چلتی ہیں (شاعری) بے ساختہ، کس موڑ پر ملے ہو (ناول)، اللہ میاں جی، تیرے سنگ در کی تلاش میں، پارسا، شرمیلی، باؤلی بھکارن (ناول)، ٹک ٹک دیدم ٹوکیو (سفرنامہ) لگن، دور دیس (سفرنامہ)، عشق عشق (افسانے)، پشیمان (افسانے)، قلم کہانیاں (افسانے)، بت شکن (ناولٹ)، پیاسی (ناول) اور چارہ گر (ناول) شامل ہیں۔ میری فرمائش پر انہوں نے بچوں کے لئے ''پھول'' میگزین میں بھی لکھا۔ وہ ماہنامہ ''پھول'' اور ''اکادمی ادبیات اطفال'' کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی سالانہ قومی ادبی کانفرنسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیں۔ 26 دسمبر 2021 کو الحمرا میں ہونے والی قومی کانفرنس میں وہ علالت کے باوجود تشریف لائیں اور ملک بھر سے آنے والے ادیبوں سے اپنے دلنشین انداز میں خطاب کیا۔ یہ ان کی زندگی کی آخری بڑی تقریب تھی جس میں انہوں نے شرکت کی۔ انہوں نے اس خواہش بلکہ ارادے کا اظہار کیا کہ شعیب مرزا مجھے ہر سال اس کانفرنس میں بلاتا ہے اور بچوں کے لیے لکھنے کے لیے کہتا ہے میں نے کچھ کہانیاں لکھی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ مجھے بچوں کے لیے ایک اچھی سی کتاب ضرور لکھی چاہیے۔ لیکن موت نے ان کو مہلت نہ دی۔ اس کانفرنس میں وہ بہت دیر تک ادیبوں کو ایوارڈ دیتی رہیں اور پھر تھک کر میز پر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ کھڑی ہو گئیں اور تمام ادیبوں کو اپنے ہاتھوں سے ایوارڈ دیئے جو آج ان ادیبوں کے لیے یادگار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ میرے ساتھ ان کی شفقت کا دورانیہ بہت طویل ہے۔ 2003 میں ''پھول'' سے

منسلک ہونے سے پہلے بھی میں جن اخبارات ورسائل کے لئے کام کرتا رہا ان سے لکھواتا رہا۔ بطور مدیر سہ ماہی ''خیال وفن'' میں نے ان کا ایک طویل انٹرویو کیا تھا جو ''انٹرویو نمبر'' میں شائع ہوا۔ ''پھول'' کے فروری کے شمارے میں بچوں کے لیے ان کا پیغام (آٹوگراف) اور قومی ادبی کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئے مگر افسوس وہ دیکھ نہ سکیں۔

1960 میں لاہور کے صنعتکار میاں عبدالرحمٰن سے ان کی شادی ہوئی۔ حال ہی میں جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو انہوں نے عدت پوری کی۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے کہ اس عمر میں عدت پوری کرنے کی کیا ضرورت ہے تو میں انہیں صرف یہی جواب دیتی تھی کہ یہ میرے خدا کا حکم ہے۔ وہ دینی، اخلاقی اور مشرقی اقدار کی حامی اور محبِ وطن تھیں۔ انہوں نے ''وطن دوست'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا اور اپنے ادارے کا نام بھی ''وطن دوست'' رکھا۔ گھر کے پتے پر بھی یہی لکھتی تھیں۔ ادب، صحافت اور سیاسی خدمات کے حوالے سے تعارف کے علاوہ جب انہیں وطن دوست کہا جاتا تو وہ اس پر خوشی اور فخر محسوس کرتی تھیں۔

بشریٰ رحمٰن شہید پاکستان حکیم محمد سعید سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ وہ ان کے بارے کہا کرتی تھیں کہ انہوں نے جتنے سانس لیے اتنی نیکیاں کیں۔ حکیم صاحب کی صاحبزادی سعدیہ راشد صاحبہ نے انہیں اپنی بہن بنا رکھا تھا جس روز بشریٰ رحمٰن کا انتقال ہوا اُسی روز سعدیہ راشد صاحبہ کے خاوند بھی وفات پا گئے یوں وہ شوہر اور بہن کے صدمے سے بیک وقت دوچار ہوئیں۔ بشریٰ رحمٰن ہمدرد مجلس شوریٰ کی تادم مرگ صدر رہیں۔ گزشتہ برس جب وہ کرونا ہونے کے بعد صحت یاب ہوئیں اور کمزوری کی وجہ سے آنا جانا مشکل ہوا تو اپنے گھر میں شوریٰ کے کئی اجلاس کروائے۔ 2007 میں ادبی خدمات پر انہیں سول ایوارڈ ''ستارۂ امتیاز'' دیا گیا جبکہ ہم نے انہیں ''معمار وطن ایوارڈ'' اور 2021 میں ''ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایوارڈ'' بھی دیا تھا۔ ان کا آخری افسانہ ''گیسو'' دسمبر 2021 میں شائع ہوا جبکہ ان کی آخری تصنیف ''سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ہے۔ امید ہے کہ سیرت کی یہ کتاب ان کی منزلوں کو آسان اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆

کوّے

حامد یزدانی

طویل اور مہیب راہداری عبور کر کے میں ایک دالان میں جا نکلتا ہوں جس کے گرد اونچی فصیلیں ایستادہ ہیں۔ ایک عجیب دھند چھائی ہوئی ہے۔ نہ صاف اجالا ہے نہ صاف اندھیرا۔ سامنے ایک سیاہ محرابی بے کواڑ دروازہ نُما ہے۔ اچانک عقب سے گھٹ کی آواز آتی ہے۔ میں مُڑ کر دیکھتا ہوں۔ میرے آنے کا راستہ بھی دیوار ہو چکا ہے۔ بھیانک اندھیرا چھانے لگتا ہے اور یکا یک ہر سمت سے بے سمت چیخیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ ادھر سیاہ محرابی دروازہ نُما سے ایک ہیولہ برآمد ہوتا ہے؛ ماحول سے بھی زیادہ ہولناک شبیہ --- کندھوں پر چغہ لٹکائے، سر پر عجیب وضع کا ہیٹ اور پاؤں میں لمبے شکاری بُوٹ --- ٹگ، ٹگ، ٹگ --- اُس کا چہرہ اندھیرے سے نیم اجالے میں آتا ہے تو میرا دل لرز کر رہ جاتا ہے --- اس کی آنکھوں کی جگہ دو گہرے تاریک غار دکھائی دیتے ہیں۔ سامنے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر دھرے دو غار --- اور ان میں سُرخ دیدے حرکت کر رہے ہیں --- دائیں بائیں --- بائیں دائیں --- خوف سے میرے بدن کو جھرجھری سی آجاتی ہے اور اُسی دم عقابوں کا

ایک غول ان عار جیسی آنکھوں پر آ جھپٹتا ہے---اور---

''اُف--- کیا مصیبت ہے!'' میں یکدم بستر پر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ ماتھا پسینے سے تر اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا ہوا۔

''کیا ہُوا؟--- کیا پھر وہی خواب---؟ بیوی نیم غنودگی کے عالم میں پوچھتی ہے۔

''ہاں---'' میں بس اِتنا ہی کہہ پاتا ہوں۔

''کتنی بار کہا ہے دائیں کروٹ سویا کریں آیۃ الکرسی اور معوذتین پڑھ کر--- مگر سُنتے ہی نہیں آپ۔'' بیوی تپائی سے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہتی ہے۔ ''اب سو رہیے، صبح عدالت بھی جانا ہے، تاریخ پر---ہمیشہ سیدھا لیٹتے ہیں--- کسی کی سُنیں تب ناں---'' بیوی بڑبڑاتی ہوئی بستر پر دراز ہو جاتی ہے اور میں اس خواب کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ اب یہ کتنے تواتر سے دکھائی دینے لگا ہے۔ پہلے تو بس کبھی کبھار ہی آتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار یا مہینے میں ایک بار۔ مگر اب---

شہری ترقی کی بلند و فتری عمارت کے مقابل ایک دیو کی ایک قدیم عمارت میں مرکزی دروازے سے کوئی تیس چالیس قدم کے فاصلے پر خراب اور نیم خراب حالت میں کھڑی سرکاری بسوں کی بے ترتیب قطار کو پار کرتے ہوئے گرد گرد راستہ ایک بے کواڑ دروازے تک پہنچتا ہے جس کی دیوار پر ایک بارش خوردہ چوبی تختی آویزاں ہے: ''خصوصی عدالت، محکمہ---''۔ اُوپر سے قوس بناتے ہوئے اس دروازہ نُما کے بعد چوکور احاطہ سا آجاتا ہے جس کے بالکل سامنے محکمے کا ڈے کیئر سنٹر ہے اور اس کے مقابل ایوانِ انصاف؛ کمرۂ خصوصی عدالت۔ درمیان میں اگر کچھ حائل ہے تو وہ ہے ایک بوڑھا، باریش برگد، دو آم کے نحیف پیڑ اور ایک بڑا سا شہتوت۔ آنے والوں کی سواریاں اسی شہتوت کی چھاؤں میں استراحت کرتی ہیں جس کی بل کھاتی قدرے جھکی ہوئی شاخ سے ایک بھوری گلہری نیچے جھانکتی ہے جیسے وہ ملزموں اور مجرموں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

ابھی یہاں کوئی نہیں پہنچا سوائے میرے۔ نہ کوئی ملزم، نہ کوئی گواہ، نہ کوئی منصف--- اور انصاف---!؟ آہستہ آہستہ کچھ چہرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ شہر کے مختلف اطراف کی گرد تلووں سے چپکائے۔ پھر جانے کہاں سے منصفِ خصوصی کی کالی سیہ جیپ نمودار ہو جاتی ہے۔ کلف لگی سفید شلوار قمیص، گرے واسکٹ اور دائیں ہاتھ میں فربہ سا موبائل سنبھالے صاحب ایک شانِ بے نیازی سے کمرۂ انصاف میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چہرا دکھائی نہیں

دیتا۔ کچھ سائل ہونٹ صاحب کے ڈرائیور کے کانوں کو گھیر لیتے ہیں۔ اس کی مونچھیں کھلنے لگتی ہیں۔

''اشتیاق احمد ولد مشتاق احمد ---!''

کرامت مسیح ولد سلامت مسیح ---!

بلاوے شروع ہو جاتے ہیں۔

حاضری دینے کے لیے، فرد جرم سننے کے لیے، شہادتیں دینے کے لیے۔ پھر وکیل اور ضمانت --- اور حنائی داڑھی والے پیادے کی مسلسل پکار ---

پوری بیالیس آوازوں کے بعد میرا نام پکارا جاتا ہے۔

نیم تاریک کمرے میں خاکی فائلوں، ایک گھنٹی اور ایک ٹیبل لیمپ سے سجے ایک بڑے مستطیل میز کے پار سے آواز آتی ہے:

''انتظار کریں' فائل دیکھ لوں''۔

خاموشی۔

مزید خاموشی۔

''محکمانہ افسر کا تحریری بیان بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ایک درخواست لکھیے میرے نام پھر غور ہوگا۔''

آواز سنائی کہتی ہے۔

''کیا لکھنا ہے درخواست میں ---؟'' میں استفسار کرتا ہوں۔

''یہ قانونی معاملہ ہے۔ وکیل کر لیجیے۔ اسے پتہ ہے کیا اور کیسے لکھنا ہے قانون کی زبان میں''۔

''وکیل؟ - - - اب وکیل کہاں سے ڈھونڈوں!---''

میز پر بائیں طرف پڑی گھنٹی کا بٹن تین بار دبتا ہے۔ کالا کوٹ اور سفید پتلون پہنے ایک نوجوان وکیل کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

''ان کی مدد کر دیں''۔ آواز کہتی ہے۔

''آیئے، میرے ساتھ''۔ میں اس نوجوان کے ساتھ باہر آجاتا ہوں جہاں سب احاطے میں بکھرے ہوئے ہیں، یہاں وہاں، کچھ برگد کے نیچے، کچھ آم اور شہتوت کے تلے --- کچھ پرسوں کی بارش کے بچے کھچے پانی سے بنے چھپڑ کے کنارے اکڑوں بیٹھے ہیں اور کچھ نے پھپھوندی لگی اینٹوں پر نشست کر رکھی ہے۔ کچھ کھڑی سواریوں پر بیٹھے ہیں --- سر جھوڑائے --- کبھی کبھی سر اُٹھا کر دیکھ لیتے ہیں، ایک دوسرے کو بے معنی سے انداز میں اور بس۔ شہتوت کی جھکی شاخ پر گلہری البتہ مسلسل حرکت میں ہے، بار بار نمودار ہوتی ہے، شرارت سے تنے تک آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے، پتہ نہیں کہاں!۔

''میری فیس ابھی دیں گے یا بعد میں؟'' نوجوان وکیل پوچھتا ہے۔

''بعد میں''۔ میں جواب دیتا ہوں۔

''آیئے، میرے ساتھ اندر''

دوسرے کمرے میں سفید شرٹ اور خاکی پتلون پہنے ٹائپسٹ کچھ ٹائپ کر رہا ہے، کوئی درخواست یا شاید کوئی فیصلہ۔ حنائی داڑھی والا پیادہ دو افراد سے مخاطب ہے: ''میں نہ کہتا تھا زیادہ جرمانہ نہیں ہونے دوں گا اور یہ جرمانہ بھی انہی پیسوں میں ادا ہو جائے گا۔ بس اگلے ہفتے آ کے رسید لے جانا۔ ٹھیک ہے؟ خوش؟''

ٹائپسٹ کی ٹک ٹک جاری ہے۔ نوجوان وکیل اس کے قریب بیٹھا میری طرف سے درخواست لکھوا رہا ہے۔ دروازے سے ٹیک لگائے ایک لڑکا رو رہا ہے۔ گہرے نیلے رنگ کی میلی شلوار قمیص میں۔ گدلی گدلی آنکھیں، شفاف آنسو۔

''رونا بند کر۔ کروا دیتے ہیں تیرا کام۔ آئندہ دیر سے نہ آنا تاریخ پر۔ یہ عدالت ہے کوئی مذاق نہیں''۔ یہ سن کر لڑکا آستین سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگتا ہے۔

''لیجیے، ہوگئی آپ کی درخواست، اتنے مہینے آپ نے یوں ہی ضائع کر دیے، پہلے بات کر لیتے، مل لیتے مجھ سے یا مولوی سے۔'' وہ پیادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ پھر مہین سے لیگل سائز ورق پر ٹائپ کی ہوئی درخواست مجھے دکھاتے ہوئے کہتا ہے: ''خیر، چلیے اب اندر صاحب کو پیش کرنی ہے یہ۔''

ہم کمرۂ عدالت کی طرف بڑھتے ہیں۔

دروازے سے باہر حنائی داڑھی والا پیادہ کسی کو رازدارانہ انداز میں کہہ رہا ہے: ''باؤجی، بھاویں اِنج کرلو بھاویں اُنج کر لو۔ گل اکو ای اے۔ پیسے بغیر کم نہیں جے بننا۔ اینتھے لوک چار چار سال توں دھکے کھا رئے نیں۔ ساڈے وکیل صاب وڈے صاب دے جوائی نیں۔ مسلہ ای کوئی نہیں۔ سمجھو، تہاڈا کم ہوگیا۔''

میں وکیل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ دو سپاہی اور ہتھکڑی میں جکڑا ایک بوڑھا میز کے سامنے کھڑے ہیں۔ میز کے اُس پار سے گرج دار آواز کہتی ہے: ''نہیں، جاؤ میں نہیں منظور کرتا اس کی ضمانت۔ یہ عدالت ہے،

مجھے انصاف کرنا ہے، انصاف چہرہ نہیں دیکھتا، عدالت سچائی کو دیکھتی ہے صرف سچائی کو۔'' پوری بیالیس آوازوں کے بعد میرا نام پکارا جاتا ہے۔

نیم تاریک کمرے میں خاکی فائلوں، ایک گھنٹی اور ایک ٹیبل لیمپ سے سجے ایک بڑے مستطیل میز کے پار سے آواز آتی ہے: ''انتظار کریں' فائل دیکھ لوں''۔

خاموشی۔

مزید خاموشی۔

''محکمانہ افسر کا تحریری بیان بے گناہی ثابت

کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ایک درخواست لکھئے میرے نام پھر غور ہوگا۔''

آواز سنائی کہتی ہے۔

''کیا لکھنا ہے درخواست میں ---؟'' میں استفسار کرتا ہوں۔

''یہ قانونی معاملہ ہے۔ وکیل کر لیجیے۔ اسے پتہ ہے کیا اور کیسے لکھنا ہے قانون کی زبان میں''۔

''وکیل؟ --- اب وکیل کہاں سے ڈھونڈوں!---''

میز پر بائیں طرف پڑی گھنٹی کا بٹن تین بار دبتا ہے۔ کالا کوٹ اور سفید پتلون پہنے ایک نوجوان وکیل کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

''ان کی مدد کر دیں''۔ آواز کہتی ہے۔

''آیئے، میرے ساتھ''۔ میں اس نوجوان کے ساتھ باہر آجاتا ہوں جہاں سب احاطے میں بکھرے ہوئے ہیں، یہاں وہاں، کچھ برگد کے نیچے، کچھ آم اور شہتوت کے تلے--- کچھ برسوں کی بارش کے بچے کھچے پانی سے بنے چھپڑ کے کنارے اکڑوں بیٹھے ہیں اور کچھ نے پھپھوندی لگی اینٹوں پر نشست کر رکھی ہے۔ کچھ کھڑی سواریوں پر بیٹھے ہیں--- سر نیہوڑائے--- کبھی کبھی سر اُٹھا کر دیکھ لیتے ہیں، ایک دوسرے کو بے معنی سے انداز میں اور بس۔ شہتوت کی جھکی شاخ پر گلہری البتہ مسلسل حرکت میں ہے، بار بار نمودار ہوتی ہے، شرارت سے تنے تک آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے، پتہ نہیں کہاں!۔

''میری فیس ابھی دیں گے یا بعد میں؟'' نوجوان وکیل پوچھتا ہے۔

''بعد میں''۔ میں جواب دیتا ہوں۔

''آیئے، میرے ساتھ اندر''

دوسرے کمرے میں سفید شرٹ اور خاکی پتلون پہنے ٹائپسٹ کچھ ٹائپ کر رہا ہے، کوئی درخواست یا شاید کوئی فیصلہ۔ حنائی داڑھی والا پیادہ دو افراد سے مخاطب ہے: ''میں نہ کہتا تھا زیادہ جرمانہ نہیں ہونے دوں گا اور یہ جرمانہ بھی انہی پیسوں میں ادا ہو جائے گا۔ بس اگلے ہفتے آ کے رسید لے جانا۔ ٹھیک ہے؟ خوش؟''

ٹائپسٹ کی ٹِک ٹِک جاری ہے۔ نوجوان وکیل اس کے قریب بیٹھا میری طرف سے درخواست لکھوا رہا ہے۔ دروازے سے ٹیک لگائے ایک لڑکا رو رہا ہے۔ گہرے نیلے رنگ کی میلی شلوار قمیص میں۔ گدلی گدلی آنکھیں، شفاف آنسو۔

''رونا بند کر۔ کروا دیتے ہیں تیرا کام۔ آئندہ دیر سے نہ آنا تاریخ پر۔ یہ عدالت ہے کوئی مذاق نہیں''۔ یہ سن کر لڑکا آستین سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگتا ہے۔

''لیجیے، ہوگئی آپ کی درخواست، اتنے مہینے آپ نے یوں ہی ضائع کر دیئے، پہلے

بات کر لیتے، مل لیتے مجھ سے یا مولوی سے۔'' وہ پیادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ پھر مہین سے لیگل سائز ورق پر ٹائپ کی ہوئی درخواست مجھے دکھاتے ہوئے کہتا ہے: ''خیر، چلیے اب اندر صاحب کو پیش کرنی ہے یہ۔''

ہم کمرۂ عدالت کی طرف بڑھتے ہیں۔

دروازے سے باہر حنائی داڑھی والا پیادہ کسی کو رازدارانہ انداز میں کہہ رہا ہے: ''باؤ جی، بھاویں اِنج کر لو بھانویں اُنج کر لو۔ گل اکو ای اے۔ پیسے بغیر کم نہیں جے بننا۔ اتھے لوک چار چار سال توں دھکے کھا رئے نیں۔ ساڈے وکیل صاب وڈے صاب دے جوائی نیں۔ مسلہ ای کوئی نئیں۔ سمجھو، تہاڈا کم ہو گیا۔''

میں وکیل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا ہوں۔ دو سپاہی اور ہتھکڑی میں جکڑا ایک بوڑھا میز کے سامنے کھڑے ہیں۔ میز کے اُس پار سے گرج دار آواز کہتی ہے: ''نہیں، جاؤ میں نہیں منظور کرتا اس کی ضمانت۔ یہ عدالت ہے،

مجھے انصاف کرنا ہے، انصاف چہرہ نہیں دیکھتا، عدالت سچائی کو دیکھتی ہے صرف سچائی کو۔'' سپاہی ملزم کو لیے وہاں سے ہٹتے ہیں۔ منصف صاحب کا ہیولہ میری نگاہ کی دسترس میں آ جاتا ہے۔

''یہ کیا!'' ایک چیخ میرے اندر ہی دم توڑ دیتی ہے۔

کندھوں پر چغہ، سر پر عجیب وضع کا ہیٹ، چہرے پر دو تاریک گہرے غار۔۔۔ سامنے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر دو آنکھیں دھری ہیں جن کے دیدے حرکت کر رہے ہیں، دائیں سے بائیں۔۔۔ بائیں سے دائیں۔

میں چیخنے کی کوشش کرتا ہوں مگر چیخ سینے ہی میں خشک ہو جاتی ہے۔ میں زور سے اپنی آنکھیں میچ لیتا ہوں کہ یہ خواب آگے چلے، عقابوں کا غول آئے اور خواب ختم ہو مگر وہاں کوئی عقاب نہیں۔۔۔ بس کوّے ہی کوّے ہیں۔۔۔ یہاں وہاں سر نیہوڑائے بیٹھے ہوئے، برگد کے نیچے، آم اور شہتوت کے تلے۔۔۔ پرسوں کی بارش کے بچے کھچے پانی سے بنے چھپڑ کے کنارے اور پھپھوندی لگی اینٹوں پر۔۔۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ عدالت سچائی کو دیکھتی ہے صرف سچائی کو۔

اور آج کی سچائی؟

شاید میں جانتا ہوں یا شہتوت کی شاخ سے لپکتی گلہری۔

ستم یہ کہ میری آواز حلق میں دفن ہے

۔۔۔ اور گلہری کی بولی کوّے سمجھتے نہیں۔

☆☆☆☆☆

پیر کا سایہ

''تنزیل! اریا و تنزیل! کہاں رہ گئے ہو؟۔۔ ماں جی بہت پریشان ہے تمھارے لیے، تنزیل میرے پیارے بھائی! کہاں ہو تم؟'' میں گلی کے سامنے والی پگڈنڈی پر چلتی تنزیل کو مسلسل آوازیں دے رہی تھی۔ مجھے پگڈنڈی کی دونوں جانب گیہوں کے ہرے بھرے کھیت بڑے بھلے لگتے ہیں مگر تب منظر کی دلکشی سے لطف اندوز ہونے کا ہوش ہی کسے تھا۔ اس وقت میرا دھیان تنزیل کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ تنزیل میرا اکلوتا بھائی تھا۔ آٹھ سال کی عمر تک وہ بہت صحت مند اور توانا تھا۔ اس کی معصومانہ حرکتیں اور شرارتیں گھر کے یاسیت زدہ آنگن میں رونق کا سبب ہوا کرتی تھیں۔ کوئی سال بھر پہلے میرا باپ، جو کہ راج مستری تھا، ایک زیرِ تعمیر عمارت کی چوتھی منزل سے گر کر موقع پر ہی دم توڑ چکا تھا۔ اس حادثے نے ہمارے مختصر کنبے پر قیامت ڈھا دی تھی۔ کل چار ہی افراد تھے اور قدرت نے ہم میں سے ایک کی گنتی کم کر دی تھی۔ غریب تھے مگر جیسے تیسے زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ باپ کی مزدوری سے گھر کے ہانڈی چولھے کا بندوبست ہو جایا کرتا تھا مگر باپ کی وفات کے بعد غربت کے علاوہ ہم تین کے کنبے کو بے کسی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ ہمارا پوچھتے تک نہ تھے۔ ایسے میں اپنے عزیز رشتہ داروں سے ہی سہارا دینے کی امید ہوتی ہے مگر انہوں نے بھی ہمارا کبھی جھوٹے منہ حال پوچھنا گوارا نہ کیا تھا۔ مجبوراً ماں جی دن کو پڑوس کے گھروں میں برتن مانجھنے جایا کرنے لگی اور رات گئے تک سینے پرونے کا تھوڑا بہت کام کر کے زندگی کی گاڑی چلانے پر کمربستہ ہو گئی۔ لیکن برا ہو مقدر کی برائی کا۔ زندگی بمشکل ابھی پرانی ڈگر پر چل ہی پڑی تھی کہ تنزیل چند روز سے کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگا۔ ہمارے غربت زدہ کنبے پر ایسی بیماری مسلط ہو گئی جس کے سر پیر کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ ماں جی جو

عزیز عادل

تھوڑے بہت پیسے کمانے لگی تھی وہ آئے روز کے طبیبوں اور حکیموں کے چکروں کی نذر ہونے لگے اور نوبت یہاں تک آ گئی کہ ایک وقت کا کھانا دو وقتوں پر تقسیم کر کے کھایا جانے لگا۔ اُدھر تنزیل کی بیماری کسی طرح ٹھیک ہی نہیں ہو رہی تھی۔

محلے کی مائی خالدہ ایک تیز و طرار ادھیڑ عمر کی عورت پیروں فقیروں کے لیے توہمات اور بیماریوں کے ستائے ہوئے کمزور عقیدے کے افراد کی کھوج میں رہتی تھی جو ان کی ہمدرد بن کر انھیں آستانوں اور پیروں کے ڈیروں کی راہ دکھا کر متاثرہ خاندان سے کچھ نہ کچھ اینٹھ لیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ پیروں فقیروں سے بھی باقاعدہ اپنا حصہ وصول کر لیا کرتی تھی۔ سادہ مزاج لوگوں کو پٹانے میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ ایک دن عین وہ اسی وقت ہمارے گھر آ گئی جس وقت تنزیل نیم جان زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کی باچھوں سے جھاگ بہہ رہا تھا، ماں جی جسے اپنے بوسیدہ دوپٹے کے پلو سے ہولے ہولے صاف کر رہی تھی۔ یہی دوپہر سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ میں صبح کے میلے برتن صحن میں ایک طرف رکھے ہوئے پانی کے مٹکے کے نزدیک بیٹھی دھو رہی تھی۔ اگرچہ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ رکھا تھا مگر گھر کا کام کاج بھی تو کرنا تھا۔ مائی خالدہ بیرونی دروازے کا پٹ کھول کر گھر کے اندر آئی اور جیسے ہی اس نے یہ منظر دیکھا، وہ تیر کی طرح ماں جی اور زمین پر پڑے تنزیل کی جانب بڑھی۔ ماں جی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مائی خالدہ کی طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے اسے خوش آمدید کہا۔ مائی خالدہ جھٹ سے وہیں زمین پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی اور تنزیل کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہنے لگی۔ ''تنزیل بیٹے! کیا ہوا ہے تجھے؟ میرے منے! یہ کیا حال ہوا ہے تیرا؟'' مائی خالدہ کی آنکھوں میں تو جیسے آنسوؤں کا سمندر لہریں لیتا پلکوں سے چھلکنے کے لیے مچل رہا تھا۔

میں اس کی باتیں سن رہی تھی اور پلٹ کر اسی کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے برتن دھو کر صحن میں پڑی چارپائی کی پائنتی سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھے اور ہاتھ پونچھ کر ان کے پاس آ گئی۔ ''السلام علیکم مائی خالدہ!'' ''وعلیکم السلام۔ فائزہ بیٹی! کیسی ہو؟ اور تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ میرے تنزیل کی یہ حالت ہے؟'' مائی خالدہ نے ناراض لہجے میں مجھ سے کہا اور پھر تنزیل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مائی خالدہ اس سے قبل بھی چند دفعہ ہمارے گھر آئی تھی مگر نہ تو اس نے کبھی تنزیل پر کوئی خاص توجہ دی تھی اور نہ ہی کبھی اس کے لہجے میں ہم گھر والوں کو کبھی اتنی اپنائیت محسوس ہوئی تھی جتنی وہ آج جتا رہی تھی۔ وہ آ کر ماں جی سے

پڑوسنوں کی ڈھیر ساری برائیاں کرتی اور ماں جی بادلِ ناخواستہ اس کی باتیں خاموشی سے سن تو لیتی مگر خود وہ کسی کی برائی کرنے سے احتراز ہی کیا کرتی۔ مائی خالدہ کے کہنے پر میں اٹھ کر کٹورے میں تھوڑا سا پانی لے آئی اور کٹورا اسے پکڑا دیا۔ مائی کے ہونٹ ہلنے لگے اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے ہاتھ میں پکڑے کٹورے پر دم کیا۔ پھر تنزیل کا سر ذرا سا اوپر اٹھا کر اس نے کٹورا اس کے منہ سے لگا لیا۔ تھوڑا سا پانی تنزیل کے منہ میں چلا گیا اور بہت سارا اس کے گلے، گردن کو تر کرتا ہوا بہہ گیا۔ ذرا دیر بعد تنزیل نے آنکھیں کھول دیں اور ماں جی اس کے یخ بستہ ماتھے کا ممتا بھرے بوسے لینے لگی۔

تنزیل کو یہ دورے پہلے بھی پڑا کرتے تھے مگر اس قدر جلدی جلدی نہیں۔

ادھر مائی خالدہ کی گفتگو کا محور بھی اب بدل چکا تھا اور اس نے ہمارے ہاں آنا جانا زیادہ کر دیا تھا۔ اب وہ ہماری پکی ہمدرد اور غمگسار بن چکی تھی۔ فائزہ! اپنی ماں کو سمجھا کہ تنزیل پر سایہ ہو گیا ہے۔ سایہ دوا دارو سے تھوڑی جاتا ہے۔ اس کے لیے پیروں فقیروں کے پاس جانا پڑتا ہے، ان کی دعائیں لینی پڑتی ہیں اور اگر کوئی زود اثر تعویذ کسی پہنچے ہوئے پیر سے کرایا جائے تو بھوت پریت وہی دن میں اڑنچھو ہو جائیں گے --- آزمائی ہوئی بات ہے قسم سے"---- میں نے مائی سے وعدہ کر لیا کہ اکیلے میں سمجھا دوں گی ماں کو تو اس دن وہ کل آنے اور اسے اور تنزیل کو ساتھ لے کر جھگی پیر کے پاس لے جانے کا کہہ کر چلی گئی۔ اگلے دن وہ علی الصبح آ دھمکی اور وہ اور ماں جی تنزیل کو لے کر جھگی پیر کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں بھی ان کے ہمراہ چل دی۔

جھگی پیر کا ٹھکانا آبادی سے دور ایک چھوٹے سے قبرستان میں تھا جہاں چند قبریں بنی ہوئی تھیں۔ قبرستان میں جگہ جگہ مٹی کے برتنوں کی ٹیکریاں بکھری پڑی تھیں اور قبریں جھاڑ جھنکاڑ میں چھپی ہوئی تھیں جیسے ان قبروں میں دفن لوگوں کے ورثا ان کو اسی وقت سے بھول چکے تھے جس دن سے انھوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ قبرستان کے ایک کونے میں گھاس پھوس کی جھگی سی تھی جس کا دہانہ کھلا ہوا تھا۔ جھگی سے متصل ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کی دیواریں پکی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور اینٹوں کے درمیان ہوا کے گزرنے اور روشنی کے لیے تھوڑی تھوڑی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ کمرے کا دروازہ لوہے کا تھا جس کا پینٹ جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا اور چوکھٹ کی اوپری راڈ سے بچوں کے سائز کا پرانا جوتا، موٹی تار میں پروئے ہوئے گھونگوں کے خول اور لوہے کی زنجیر کا ایک ٹکڑا لٹکا ہوا تھا اور دہلیز پر تقریباً چالیس سال کا ایک ہٹا کٹا کالا ہجنگ شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے بال کھچڑی زدہ

تھے۔ ''سلام لیکم چھوٹے پیر سائیں!'' ہم سے دو قدم آگے چلتی ہوئی مائی خالدہ جوں ہی اس آدمی کے نزدیک پہنچی، نے سلام کیا۔ ''سلام--- خوش رہو بی بی'' اس شخص نے بڑی گونجیلی آواز میں سلام کا جواب دیا اور سر اٹھا کر ہمیں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں میں غلاظت بھری ہوئی تھی۔

''چھوٹے پیر سائیں! جھگی پیر سائیں سے ملنا ہے، ملا دے، تیرا بڑا احسان ہوگا ہم مجبوروں پر۔'' مائی خالدہ نے بڑی مسکین آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ پہلے تو کچھ دیر خاموشی سے ہمیں تکتا رہا۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ گول مٹول تنزیل پر پڑی تو بس اسے گھورتا گیا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں خباثت صاف دکھائی دے رہی تھی اور مجھے اس سے گھن سی آنے لگی۔ اس نے سر ہلا کر پیر صاحب کی اندر موجودگی کا اعلان کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں جھگی میں جانے کا کہا۔ ماں جی نے تنزیل کا ہاتھ تھاما اور مائی خالدہ کو آگے جانے کا اشارہ کیا اور میں ان تینوں کے داخل ہونے کے بعد جھگی میں داخل ہوئی۔

زمین پر پرال بچھی ہوئی تھی اور سامنے ایک لمبے بالوں والا دھان پان سا شخص بیٹھا ہوا تھا جس کا سر کسی رعشہ زدہ کی طرح مسلسل ہل رہا تھا۔ اس کی لال آنکھوں میں کیچڑ بھرا ہوا تھا اور پتلے پیروں کے ناخن دور سے بیلچے کی طرح بڑھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے قریب دو تھیلیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں ایک کا رنگ سیاہ اور دوسری کا خیالا تھا۔ مائی خالدہ جھک کر کچھ دیر اس کے کان میں کھسر پھسر کرتی رہی جبکہ ماں جی تنزیل کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔ پیر صاحب نے تنزیل کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ تنزیل ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا۔ پیر صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا اور اس کے سر پر اپنا میلا ہاتھ پھیرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا جسے میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ پھر وہ تنزیل کی پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھیں کسی طبیب کی طرح دیکھنے لگا؛ خدا جانے وہ کیا دیکھنا چاہتا تھا۔ تنزیل کا خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کی رنگت یکدم پیلی پڑ گئی۔ وہ پیچھے کی طرف گرنے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے استخوانی ہاتھ نے اسے سہارا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ مائی خالدہ کے اشارے پر میں نے قریب ہی پڑے گھڑے سے کٹورے میں پانی ڈال کر پیر صاحب کو پکڑا دیا۔ پیر صاحب نے پانی پر پھونکا اور تنزیل کو پلانے لگا۔ اس دفعہ دورہ کافی شدید تھا۔ تنزیل کی حالت بہت وقت گزرنے کے بعد سنبھلی تھی۔ پیر صاحب نے اپنے خادم خاص کو آواز دی اور جب وہ اندر آیا تو اس سے کہنے لگا۔ ''بچے کو

سنبھالنے میں ان بیبیوں کی مدد کرو اور انھیں گھر پہنچاؤ۔ دیکھو! بچے کا خاص خیال رکھنا اور جاتے ہوئے یہ تعویذ کہیں دبا دینا'' پیر صاحب نے سیاہ رنگ کی تھیلی سے سیاہ چمڑے میں بند کیا ہوا تعویذ نکالا اور اپنے خادم خاص کے حوالے کر دیا۔

واپسی میں خادم خاص نے تمام راستے تنزیل کو اپنے ساتھ رکھا۔ ماں جی اور مائی خالدہ دو میل کے پیدل سفر کے دوران باتوں میں مشغول رہیں اور میں خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ خادم خاص تنزیل کو ساتھ لیے ہم سے آگے جا رہا تھا۔ نجانے اس نے راستے میں تنزیل کو ایسی کیا پٹی پڑھائی کہ جب ہم گاؤں میں اپنی گلی کی سمت مڑنے لگے اور جب خادم خاص نے کہا ''میں پیر صاحب کے کہنے کے مطابق تعویذ دبانے کے لیے کوئی ویران جگہ تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ تم لوگ جاؤ'' تو وہ بھی اس کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ ماں جی اور میں نے بہتیرا سمجھایا کہ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں، گھر چلتے ہیں مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور بالآخر وہ خادم خاص کے ساتھ چلا گیا۔

تنزیل کو خادم خاص کے ساتھ گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی مگر وہ ابھی تک گھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ خادم خاص کو تو ویسے بھی سیدھا اپنے ٹھکانے جانا تھا مگر تنزیل۔۔۔ خدا جانے کیا سبب تھا جو اس کے گھر واپس آنے میں مانع تھا۔ ماں جی کی طرح میرے دل کو بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں پھر سے اس کی طبیعت نہ بگڑ چکی ہو اور وہ بے یار و مددگار کہیں پڑا ہوا ہو اس لیے ماں جی کی فکرمندی دیکھ کر میں تنزیل کی تلاش میں اس طرف نکل گئی جس طرف وہ دونوں گئے تھے۔

گیہوں کے کھیت پیچھے رہ گئے اور برساتی نالے کے اس طرف کی بے کاشت زمین کا آغاز ہو گیا۔ ذہن میں یہی بات تھی کہ خادم خاص نے تعویذ کو کسی ویران جگہ دفن کرنا تھا اس لیے اس کے لیے یہ جگہ میرے خیال میں زیادہ مناسب تھی لہٰذا ان دونوں کو بھی یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ ذرا دور چند درخت نظر آئے جن کے اوپر کچھ پرندے منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔ میں اس طرف کو بڑھی تو ایک مینڈیر پر مجھے تنزیل کے پیر کے سائز کا جوتا پڑا ہوا ملا جس کا رنگ بالکل اس کے پہنے ہوئے جوتوں جیسا تھا۔ میرا دل حلق میں آ گیا اور ذہن پر برے خیالات کی یلغار سی ہو گئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ درختوں کے اس جھنڈ میں داخل ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک بڑا سا کنواں تھا۔ کنویں کی گولائی میں چنے گئے پتھروں کے درمیان سے انجیر کا ایک درخت نکلا ہوا تھا جس کی شاخیں کنویں میں لٹکی ہوئی تھیں اور ایک شاخ میں ویسے ہی رنگ کے کپڑے کا ٹکڑا اٹکا ہوا تھا جس رنگ کا لباس تنزیل نے پہن رکھا تھا۔

☆☆☆☆☆

غزل

خواب میں خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
اے مرے آج ! مرے کل کا پتا دے مجھ کو

اس طرح بانٹ کہ سمجھے نہ کوئی لوٹ کا مال
وار کر سہرے پہ بچّوں میں لٹا دے مجھ کو

خوف کیا کیا مری نس نس میں دھنسے جاتے ہیں
چاہتا ہوں کوئی پتھر کا بنا دے مجھ کو

میرے ناقد! میں کوئی موم کا پتلا تو نہیں
کوئی کس طور مرے قد سے گھٹا دے مجھ کو

تیری آنکھیں ہیں کہ ٹھہرے ہوئے پل اے خالد!
وقت کیونکر ترے پہلو سے اُٹھا دے مجھ کو

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نقشِ طلب ربط سر و سنگ ہے
قطرۂ خوں ، خانۂ ارژنگ ہے

غزل

ہر چند ظفر کا ہے وسیلہ تو سفر بھی
ہے اس میں کسی دیکھنے والے کی خطا کیا
رہ بھول گئے گھر کی رہا یاد نہ گھر بھی
لگ جاتی ہے بندے کو خود اپنی ہی نظر بھی

جس پُل سے گزرنا ہے وہ تلوار کی ہے دھار
جو قتل نہ ہو میرے قبیلے* سے نہیں وہ
یکساں ہیں چپ و راست اِدھر قعر اِدھر بھی
ہے روشنیِ طبع بلا بسکہ ہنر بھی

احوال سنائیں کسے کیا آب و ہوا کے
سر تن سے جدا چاہیے؟ یا قصد ہے سولی
ٹِک پائے بگولے نہ ٹھہر پائے بھنور بھی
گردن ہی نہیں دوش پہ گردن پہ ہے سر بھی

یہ دفن بگولے میں تو وہ غرق بھنور میں
ہے عدل پری اہل ہے شہزادہ ہی یا دیو
ہے خشک جو دامن تو بھی کیا، کیا ہے جو تر بھی
زاری ہے عبث، زور بھی درکار ہے زر بھی

نایاب نہیں عدل و مساوات جہاں میں
چھن پائے نہ مٹی مری، چھن پائے تو شاید
جتنی ہے دُم فیل ہے اتنی دم خر بھی
مل جائے کسی چھاننے والے کو گہر بھی

شے کوئی بھی خالص نہیں دنیائے دَنی میں
ہے شر میں اگر خیر تو ہے خیر میں شر بھی

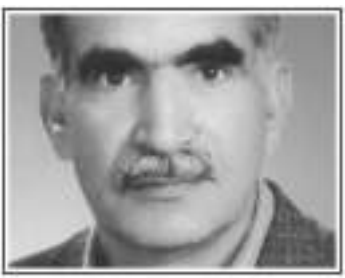

ایسا نہیں دن کوئی جو گزرا نہ ہو بے شام
ایسی نہیں شب کوئی نہ ہو جس کی سحر بھی

اس حال میں کہنا ہے نہ کہنے کے برابر
جب بات میں بعد از اگر آ جائے مگر بھی

محمد ارشاد

*گریز از صفِ ماہر کہ مردِ غوغا نیست — کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست — نظیری
بملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را — کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست — اقبال

غزل

چلیں ہم صبح، جانے کب سفر میں شام ہو جائے
نہ ہو ایسا کہ رستے میں ٹریفک جام ہو جائے

گزارش آپ سے اتنی ہے تجدیدِ تعلق کو
کوئی پیغام آ جائے کوئی ارقام ہو جائے

کہے قاصرؔ محبت کا جسے بس کام آتا ہے
کرے گا کیا اگر اس کام میں ناکام ہو جائے

نیا پن ڈھونڈتا ہوں میں خیالوں کے تناظر میں
اسی احساس کے صدقے کوئی ابہام ہو جائے

مرے اشکوں کی جھلمل کے یہ دو عنوان ہوتے ہیں
جہاں کشمیر ہو جائے وہاں آسام ہو جائے

یہی سمجھو محبت میں ہوئے ہو سرخ رو ثاقبؔ
گھنی بدناموں میں جب تمھارا نام ہو جائے

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھ تو اے دلِ تیرہ ترے گھر کون آیا
اشک بن کر مری آنکھوں میں اُتر کون آیا

غزل

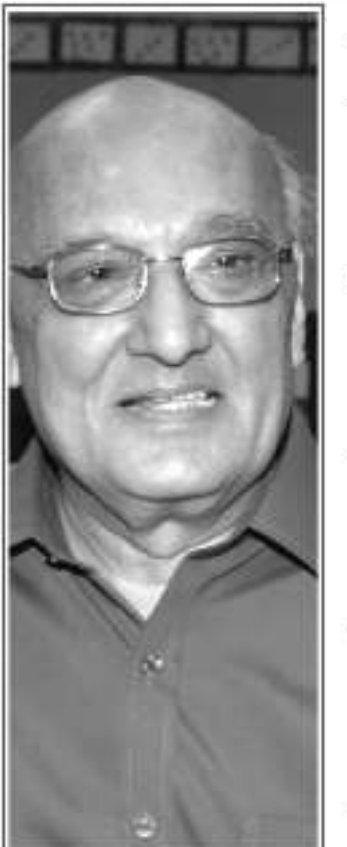

آتے پل سے بیگانہ ہیں ہم اور تم اور وہ
ایک ادھورا افسانہ ہیں ہم اور تم اور وہ

ہجر سمندر، وصل کا لمحہ، کیسے ماپ سکیں!
اپنا اپنا پیمانہ ہیں ہم اور تم اور وہ

باہر باہر جو بھی کچھ ہے سب ہے وہ بہروپ
اندر سے تو ویرانہ ہیں ہم اور تم اور وہ

سمٹے ہیں اک پیاس کے اندر، ساغر، ساقی، غم
یعنی پورا میخانہ ہیں ہم اور تم اور وہ

پڑے ہوئے ہیں شعر و سخن کی دیوی کے آگے
جیسے کوئی نذرانہ ہیں ہم اور تم اور وہ

جُرم وہ جانے تھا کہ نہیں تھا، کیا تھا وہ نقصان!
بھرتے جس کا ہرجانہ ہیں ہم اور تم اور وہ

امجد اسلام امجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آخرِ شب خواب کا گلشن سنہرا ہو گیا
صبح کی ڈالی پہ غنچہ کھل گیا تعبیر کا

غزل

اتنی سی اپنی خواب کہانی ہے اور بس
اس نے اِدھر نگاہ اٹھانی ہے اور بس

کرنی ہے اُس سے ایک ملاقات آخری
جو رہ گئی ہے بات بتانی ہے اور بس

بادِ نشاطِ باغِ بدن سے کسی طرح
لَو اک چراغِ غم کی بچانی ہے اور بس

ظاہر نگر میں صادِ دل و جاں کی داد کیا
اظہارِ خیر و خُلق زبانی ہے اور بس

برہم ہوئی ہوا تو بچے گا نہ قصرِ شاہ
اُس کو تو ایک اینٹ ہلانی ہے اور بس

جیسے سخن میں جرم ہوا عرضِ مدعا
تصویر سی کوئی بھی بنانی ہے اور بس

مدت سے اک جگہ پہ ہے قصّہ رکا ہوا
اک بے جواز طول بیانی ہے اور بس

یہ کیا کہ سوچ روحِ رجا سے جدا رہے
کیا رمزِ ہست اشک فشانی ہے اور بس

عالی طلب نہیں ہمیں مال و منال کی
کافی کمالِ حرف و معانی ہے اور بس

جلیل عالی

غزل

فقیرِ بے نوا کی اک ادا سے
الٹتے تخت دیکھے ہیں دعا سے

فرستادہ اسے کہنا بجا ہے
کوئی شکوہ نہیں جس کو خدا سے

طنابِ خیمۂ شب جل بجھی تھی
وہ کیوں الجھا رہا آخر ہوا سے

ہوس تھی حضرتِ واعظ کے دل میں
ہمیں کیا واسطہ بندِ قبا سے

سفر میں ہمسرِ منزل بھی ہو گی
جسے نسبت رہی بانگِ درا سے

یہی عادت رہی شیخِ حرم کی
ڈراتا ہے ہمیں روزِ جزا سے

حسن عسکری کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الزام لگائیں گے ، یاروں پہ وہ کیا خالد
یاروں کے سوا خالد ، دشمن ہمیں کیا دیں گے

غزل

کچھ کام نہ آئے گی اب عکس گری اپنی
توڑے گی سب آئینے آشفتہ سری اپنی

پت جھڑ کے تسلّط کو تسلیم نہیں کرتے
شاخوں پہ سجا کر بھی ہم بے ثمری اپنی

گھر جانے کی خواہش میں یہ خوف بھی لاحق ہے
لے جائے کہاں جانے پھر دربدری اپنی

آئینہ مقابل ہو اور دیکھ لیں ہم تجھ کو
حائل ہے ابھی اِس میں کچھ کم نظری اپنی

اس واسطے کرتے ہیں ہم عام ہُنر اپنے
کھُل جائے نہ دُنیا پر ہر بے ہُنری اپنی

آیا ہے وہی پہلے پت جھڑ کی نگاہوں میں
جس پیڑ نے رکھی تھی ہر شاخ ہری اپنی

حالات نے ہم کو بھی پابستہ کیا آخر
وُہ عزمِ سفر اپنا، یہ بے سفری اپنی!

تصویر تو ہونا تھی پھر ہوش رُبا ایسی!
کچھ نقش قیامت کے، کچھ نقش گری اپنی

دریا تو نسیمؔ اُس کی دہلیز تک آیا تھا
پگلی نے مگر پھر بھی گاگر نہ بھری اپنی

نسیمِ سحر

غزل

صورتِ حال سے گھبرائے ہُوئے لگتے ہو
عشق پنجرے میں نئے آئے ہُوئے لگتے ہو

جانتے ہو مری جاں! رمز و اشارے سارے
تم تو پہلے سے کہیں بھائے ہُوئے لگتے ہو

واقفِ مہر و وفا، لطف و عنایت کی پرکھ
ماسبق کی طرح دہرائے ہُوئے لگتے ہو

جب کبھی دیکھا ہے خوابوں ہی میں گم دیکھا ہے
چشمکِ یار کے بہلائے ہُوئے لگتے ہو

خود کو ظاہر نہ کرو، رنگِ بیاں سے لیکن
تم اُسی شوخ کے بھڑکائے ہُوئے لگتے ہو

خاک زادوں میں جو آ بیٹھے ہو خلعت پہنے
کسی دربار کے ٹھکرائے ہُوئے لگتے ہو

اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر پاتے
تم بھی مزدور ہو اور لائے ہُوئے لگتے ہو

موت کے ساتھ بھی اِک معرکہ آرائی ہے
اور ہستی سے بھی تنگ آئے ہوئے لگتے ہو

ہم نے مانا کہ نہیں بنتی ہے اُس سے لیکن
ماسوا سے بھی تو اُکتائے ہُوئے لگتے ہو

یہ قیامت کی گھڑی بھی تو گذر جائے گی
اِس قدر کس لیے گھبرائے ہُوئے لگتے ہو

میر کی خاک سے ٹھہرانے لگے ہو نسبت
کسی سودائی کے بہکائے ہُوئے لگتے ہو

یار کس منہ سے لیا غالبِ آشفتہ کا نام
ذوق کی طرح سے بل کھائے ہُوئے لگتے ہو

روز کہنے لگے ہو تازہ بہ تازہ اشعار
حضرتِ داغ کے گرمائے ہُوئے لگتے ہو

وہی خوشبو پسِ الفاظ پتہ دیتی ہے
فکرِ اقبال کے مہکائے ہُوئے لگتے ہو

فیض کے بعد لیا چاہتے ہو نام کوئی
ظفر اقبال تلک آئے ہُوئے لگتے ہو

خود کو آزاد سمجھ بیٹھے ہو، لیکن خاورؔ
کسی دیوار میں چنوائے ہُوئے لگتے ہو!

خاور اعجاز

غزل

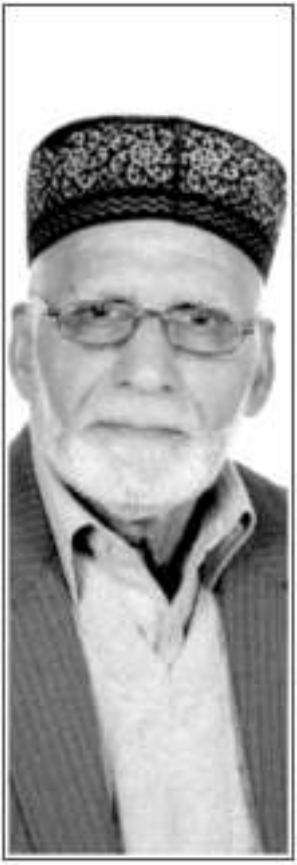

کبھی نہ سوچا، خبر تھی کس کو، دلِ حزیں کا یہ حال ہوگا
گماں نہیں تھا بچھڑ کے اِک بے وفا سے اتنا ملال ہوگا

وصال کے دِلنواز لمحوں، قرابتوں کی حسین رُت میں
بھلا دیا تھا یہ دو دِلوں نے بچھڑ کے جینا محال ہوگا

خدا کرے گر مری وفائیں بھی رنگ لائیں ہمیں ملائیں
نہ میرا ماضی رہے گا ماضی نہ حال ہی میرا حال ہوگا

جنم جنم سے ہے پیار جتنا ہمیشہ کرتے رہیں گے اتنا
زمانہ دیکھے گا ہو کے حیراں یہ آپ اپنی مثال ہوگا

جو ترکِ الفت کے بعد بھی ہم ملے تو منظر عجیب ہوگا
نہ اُن کے لب پر جواب ہوگا نہ میرے دل میں سوال ہوگا

رشید آفرین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لہر چکرانے ، ہوا پازیب چھنکانے لگی
چاند اب ڈالے گا پانی میں دُھمال اُس کے لیے

غزل

اُس کے ماتھے پر ستارے کو پڑھا ہے
یوں سمجھ لو ، اک صحیفے کو پڑھا ہے

بولتی ہیں اُس میں، ساری گُم صدائیں
میں نے خاموشی کے لمحے کو پڑھا ہے

جانتا ہے ، خاک میں کیا صورتیں ہیں
کوزہ گر نے ذرے ذرے کو پڑھا ہے

دشت کی جانب لپکتا ہے جو دریا
شاید اُس نے میرے شجرے کو پڑھا ہے

گُھل گئے ہیں شہر بھر کے لوگ مجھ پر
جب کہ میں نے ایک چہرے کو پڑھا ہے

ڈر رہا ہوں آنے والے موسموں سے
میں نے دیواروں پہ لکھے کو پڑھا ہے

میں شجر کا دکھ بتا سکتا ہوں اطہر
میں نے اُس کے زرد پتے کو پڑھا ہے

ممتاز اطہر

غزل

ہے وہی مزاجِ ستم گراں، لبِ مہرباں نہیں کھولنا
ابھی آندھیاں بڑی تیز ہیں، ابھی کھڑکیاں نہیں کھولنا

میں ہتھیلیوں پہ دکھائی دیتا رہوں گا تجھ کو، مگر مجھے
کوئی اور ڈھونڈنے آئے بھی تو ہتھیلیاں نہیں کھولنا

جنھیں شہرِ آب عزیز تھا، وسفر نصیب چلے گئے
کوئی ساحلوں پہ پکارتا رہا، کشتیاں نہیں کھولنا!

یہ غمِ جہاں کی اذیتیں تو میں جھیل لوں گا کسی طرح
مرے ہم سخن! کہیں بیچ میں غمِ دوستاں نہیں کھولنا

یہ جو چار دن مرے پاس ہیں، میں تمھاری قید میں کاٹ لوں
مجھے پا بجولاں ہی رہنے دو، مری رسیاں نہیں کھولنا

مری بیٹیو! تمھیں اپنے اپنے گھروں میں رہنا نصیب ہو
مری بیٹیو! وہاں کوئی کچھ بھی کہے، زباں نہیں کھولنا

مرے شب کدہ میں جو خواب ہیں، کبھی اپنی آنکھ سے دیکھنا
مگر اس حکایتِ اَن کہی کو انیسِ جاں نہیں کھولنا!

محمد انیس انصاری

غزل

لکھی نصیب میں تھی در بہ در کی بے چینی
سو زندگی نہیں ، میں نے بسر کی بے چینی

میں آنسوؤں کو تبسّم میں ڈھال لیتا ہوں
کھلے گی کس پہ مری چشمِ تر کی بے چینی

اگرچہ ایک ہی کمرہ ہے میرے حصّے میں
مجھے ملی ہے مگر سارے گھر کی بے چینی

پلٹ کے آیا تو بچوں نے اجنبی جانا
جمی تھی چہرے پہ ایسی سفر کی بے چینی

یہ کل کی بات ہے جب صبح آئنہ دیکھا
تو شام تک چلی آئی سحر کی بے چینی

زبور جبر میں ترمیم ہو نہیں پاتی
ریاضتوں کا صلہ عمر بھر کی بے چینی

مری کہانی میں اب کچھ نہیں بچا ناصرؔ
اُکھڑتی سانس ہے اور چارہ گر کی بے چینی

ناصر علی سیّد

غزل

بارش میں لطف اور اذیّت کا فرق ہے
تیرے مکاں کی اور مری چھت کا فرق ہے

تو بھی ہے میری طرح اسی گوشت پوست کا
لیکن گداز دل کا محبت کا فرق ہے

میری طرح تجھے بھی کڑا عشق ہے مگر
دونوں کے درمیان عبادت کا فرق ہے

تم ہو ازل کی صبح تو میں ہوں ابد کی شام
میرے تمہارے بیچ قیامت کا فرق ہے

ہم دونوں اس کے عشق میں برباد ہیں مگر
مجھ میں، رقیب میں قد و قامت کا فرق ہے

میرا نہ رنج کر جو میں پہلے گزر گیا
بس ایک دو دنوں کی مسافت کا فرق ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اڑانیں دوڑتی پھرتی ہیں تن میں رفعتیں بن کر
یہ جاں ہو گی اسیرِ بام و در آہستہ آہستہ

غزلیں

باغ بغیچے ، دیواریں در دریا بُرد ہوئے
ہنستے بستے کتنے ہی گھر دریا بُرد ہوئے

گلیوں میں گزری عمریں ہم کہاں تلاش کریں
عہدِ رفتہ کے سب منظر دریا بُرد ہوئے

جن پیڑوں کے سائے میں ہم بیٹھا کرتے تھے
پیپل ، شیشم، کابلی کیکر دریا بُرد ہوئے

کیسی کیسی پیاری شکلیں جھلک دکھاتی آتی تھیں
کہاں سے آئیں گے بت، آذر دریا بُرد ہوئے

مکر و فریب ریا والے ہی سامنے آتے ہیں
پیار خلوص کے سارے مظہر دریا بُرد ہوئے

آج اگر گلزار ہیں باقی اِن کی قدر کرو
کل مت کہنا قیمتی گوہر دریا بُرد ہوئے

گلزار بخاری

اِسی لیے کوئی کشتی بنانے والا ہے
اُسے خبر ہے کہ طوفان آنے والا ہے

سفینہ جس کا بنا تھا پناہ خلقت کی
اُسی کا لختِ جگر ڈوب جانے والا ہے

نبی کو آ کے بتایا تھا اُس کے بیٹوں نے
کہ اُس کے لعل کو اِک گرگ کھانے والا ہے

کنوئیں میں پھینکنے والوں پہ مصر جا کے کُھلا
کہ ان کا بھائی وہاں تخت پانے والا ہے

ملے نہ بُردہ فروشوں کو بھائی یوسفؑ سا
قبیلہ لالچی ہے بیچ کھانے والا ہے

کریگا یوسفؑ و یامین کو وہی یکجا
خدا ہی بچھڑے ہوؤں کو ملانے والا ہے

چراغ خانۂ یعقوبؑ دیکھیے گلزار
یہی نصیب زلیخا سجانے والا ہے

غزلیں

نور کا پیغام بر ٹوٹا نہیں
آج تک نجمِ سحر ٹوٹا نہیں

اس میں کچھ دانائیوں کا ہاتھ تھا
میری نادانی سے گھر ٹوٹا نہیں

پوچھ کر وجدان سے مجھ کو بتا
چاند کیوں بارِ دگر ٹوٹا نہیں

عمر بھر اونچی اڑانوں میں رہے
خاک سے رشتہ مگر ٹوٹا نہیں

شور ہے جتنا بپا چاروں طرف
قہر ہم پر اس قدر ٹوٹا نہیں

کوئی تو مجھ میں ہے اعجاز ہنر
مجھ سے میرا ہم سفر ٹوٹا نہیں

میرے اندر بھی کئی بھونچال تھے
میں ترے زیرِ اثر ٹوٹا نہیں

یعقوب پرواز

رہ گیا ہے اس قدر ہی اب کسی سے رابطہ
جاں بلب کا جس طرح ہو زندگی سے رابطہ

میں تری پہچان کا دعویٰ کروں تو کس طرح
جب کہ ہے ٹوٹا ہوا میرا ہی مجھ سے رابطہ

دیدنی ہے یہ محبت کا نیا انداز بھی
چاند سے ترکِ تعلق ، چاندنی سے رابطہ

بس یونہی سب کی نگاہوں میں کھٹکنے کے سوا
کچھ بھی تو باقی نہیں اُس کی گلی سے رابطہ

ہو 'وفاداری بشرطِ استواری' اس طرح
ٹوٹنے پر بھی رہے قائم اُسی سے رابطہ

ہے تعلق کی یہ صورت میرے اُس کے درمیاں
ایک لمحے کا ہو جیسے اک صدی سے رابطہ

غزلیں

پاگل ہوا نے ایسے اُڑایا اِدھر اُدھر
پتوں کی طرح ہم کو بکھیرا اِدھر اُدھر

اک دن ٹھہر گئی تھی کسی پر ہماری آنکھ
اُس دن کے بعد ہم نے نہ دیکھا اِدھر اُدھر

دینارِ عشق جیسے بھی چاہو اُچھال لو
لکھا ملے گا نام ہمارا اِدھر اُدھر

شاید وہ خواب اُس کی مسہری پہ رہ گیا
جس کے لیے میں نیند میں بھٹکا اِدھر اُدھر

جس روز ہم اِدھر سے اُدھر ہو گئے کہیں
ڈھونڈے گی پھر ہمیں یہی دنیا اِدھر اُدھر

کچھ اور کھڑکیاں بھی کھلی تھیں، مگر حسنؔ
ہم نے قسم خدا کی نہ جھانکا اِدھر اُدھر

حسن عباس رضا

اُس وقت دفعتہً وہ مجھے یاد آ گیا
جب میرے روبرو مرا ہمزاد آ گیا

خوشبو سے دل، تو نُور سے کمرے دمک اُٹھے
ایسا لگا کہ کوئی پری زاد آ گیا

جب حوصلہ نہیں تھا، تو پھر اُس گلی میں کیوں؟
لے کر مجھے تو اے دلِ برباد آ گیا

تکیے میں آ بسیں گی چنبیلی کی خوشبوئیں
خوالوں میں بھی اگر سمن آباد آ گیا

کیوں چڑھ گیا ہے آنکھ کا دجلہ حسنؔ رضا
کیا پھر خیالِ بصرہ و بغداد آ گیا؟

غزلیں

گرچہ ہوتی ہیں بجلیاں موجود
پھر بھی رہتے ہیں آشیاں موجود

حال کیوں ہے زمین کا ابتر
جبکہ اس پر ہے آسماں موجود

محوِ عہدِ وفا ہیں ہم دونوں
کوئی لگتا ہے درمیاں موجود

پھر بڑھو منزلِ یقیں کی طرف
ذہن میں ہے اگر گماں موجود

زلزلے ہوں کہ آندھیاں ثاقب
پھر بھی رہتی ہیں بستیاں موجود

منظور ثاقب

میری سوچ کا آہو دور جا نکلتا ہے
جب کوئی ذرا سا بھی آپ سا نکلتا ہے

بے سبب بلوتے ہیں بات بے تکی کچھ لوگ
جیسے بات سے کوئی ذائقہ نکلتا ہے

گدگدانے لگتا ہے مجھ کو فتح کا احساس
مے کدے سے جب کوئی پارسا نکلتا ہے

جنگ گھیر لیتی ہے امن کے نتیجے میں
جنگ کے نتیجے میں امن آ نکلتا ہے

جائزہ تو بنتا ہے اس عمل کا ثاقب جی
غیر قوم کا جس پر قہقہہ نکلتا ہے

غزلیں

ایسے رہے حالات تو ہے مات بہرطور
اتریں گی یہاں دیکھنا آفات بہرطور
سورج کے اُجالوں کو جو رکھ دیتے ہیں گروی
پھر ان کا مقدر ہے سیہ رات بہرطور
دکھلاتا ہے ہر روز وہ ہاتھوں کی صفائی
سب جانتے ہیں اس کی کرامات بہرطور
جو ڈھونڈتے رہتے ہیں یہاں لوگ سہارے
ملتی ہے انھیں مرگ مفاجات بہرطور
اُمید نہیں اس سے کسی خیر کی ہم کو
دے گا وہ ہمیں درد کی سوغات بہرطور

اس شہرِ خرابی میں زبوں حال ہیں سارے
ہر گام پہ مِل جاتے ہیں صدمات بہرطور
مانگی ہیں دعائیں بھی بہت نالے کیے ہیں
بدلے نہیں پھر بھی مرے حالات بہرطور
مقروضِ عنایات جلیل اس کا ہوں پھر بھی
کر جاتا ہے جو ہاتھ مرے سات بہرطور

احمد جلیل

ایک ہی منظر بن جاتا ہے
درد سمندر بن جاتا ہے

اس کے ہجر میں لمحہ لمحہ
چلتا خنجر بن جاتا ہے

پھول، دھنک ، مہتاب ملیں تو
اس کا پیکر بن جاتا ہے

جس دل میں ہو پیار کی پوجا
دل وہ مندر بن جاتا ہے

سینے میں دل بھی رکھتا ہے
پھر بھی پتھر بن جاتا ہے

میں دھرتی پر رہ جاتا ہوں
اور وہ امبر بن جاتا ہے

غزل

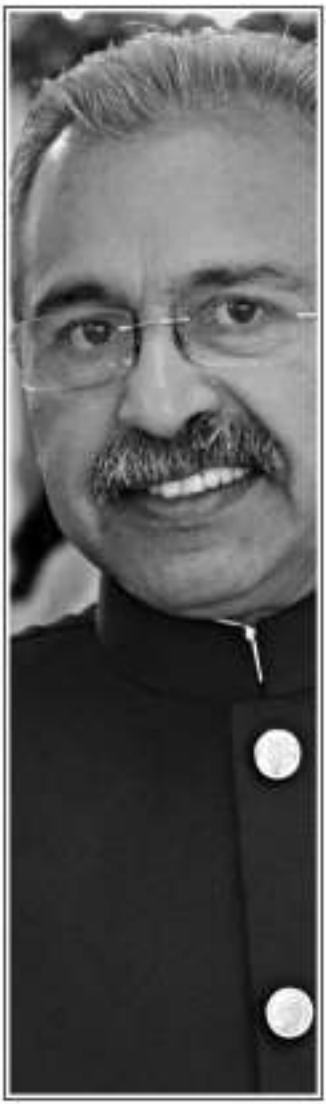

صدیوں سے تنی سر پہ سیہ رات بدل کر
تبدیلی تو آتی ہے روایات بدل کر

بچ سکتا نہیں کوئی زمانے کی نظر سے
دیکھا ہے بہت جائے ملاقات بدل کر

ہم بھی تو انھی وحشی درندوں کی طرح ہیں
جو گھات لگاتے ہیں مقامات بدل کر

دنیا کو بدلنا بڑا مشکل ہے لہٰذا
رہتے ہیں فرشتے بھی یہاں ذات بدل کر

دیواروں کے ہیں کان، در و بام کی آنکھیں
توہینِ محبت نہ کرو بات بدل کر

ایسے بھی قدم ہوتے ہیں اللہ بچائے
صحراؤں میں رکھ دیتے ہیں باغات بدل کر

سوچا ہے کبھی میرے علاوہ بھی کسی نے
جائیں گے کہاں ارض و سماوات بدل کر

محسوس ہوا مل کے کسی سے مجھے راحت
کم ظرف بدلتا نہیں اوقات بدل کر

راحت سرحدی

غزلیں

مَنارے ڈھے گئے کردار والے
کہ عنقا ہو گئے ایثار والے
بہت پیچھے کہیں اب رہ گئے ہیں
وہی خرگوش کی رفتار والے
بس ایسے ہی اکڑ جاتی ہے گردن
ملیں جب راستے ہموار والے
وہ خود معیار سے کم تر ملے ہیں
بہت بنتے تھے جو معیار والے
قیامت تک نہیں نبھتا تعلق
رویّے ہوں جو کاروبار والے

خدایا! دور کر دے ، دُور کر دے
ہمارے وَسوسے بے کار والے
کھلے دشمن ہیں امن و آشتی کے
یہ بلوائی ، یہ ہاہاکار والے
کبھی چوروں کبھی غنڈوں پہ اکرام
نرالے رنگ ہیں سرکار والے
اناڑی تھے خریداری میں راشد
لگے چکّر کئی بازار والے

ممتاز راشد لاہوری

نہیں اب سُنبل و کچنار والے
مناظر کھو گئے مہکار والے

سُنا کرتے تھے نغمے ہم بھی کیا کیا
کبھی ایمن ، کبھی ملہار والے

حسیں ہمدم کے دم سے ضَوفشاں ہیں
حسیں جلوے گُل و گلزار والے

بدل دیتے ہیں فرسودہ روایت
اگر ضدی بھی ہوں انکار والے

تجھے کیسے ملے گی کامیابی
ترے نخرے نہیں فنکار والے

چلو کچھ تو گرانی روکتے ہیں
کہ جو بازار ہیں اتوار والے

جنوبی سمت کو بھولیں نہ راشد
ہمارے دوست پوٹھوہار والے

غزل

گم گشتہ محبت کو صدا کیوں نہیں دیتے
اک تاج محل پھر سے بنا کیوں نہیں دیتے

یہ سارا جہاں جھوم اُٹھے جس کے اثر سے
وہ گیت زمانے کو سنا کیوں نہیں دیتے

لٹتا ہوا آنکھوں سے چمن دیکھ رہے ہو
گلشن سے لٹیروں کو بھگا کیوں نہیں دیتے

اے حسن و محبت کی شریعت کے خداؤ!
چاہت کے دیے دل میں جلا کیوں نہیں دیتے

ہو درد کی دولت سے غنی سارا زمانہ
الفت کے خزانوں کو لٹا کیوں نہیں دیتے

حسنین بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفا دار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

کچھ ایسا زور تھا خود آگہی کے پانی میں
میں خود سے دور نکلتا گیا روانی میں

یہی تو ڈر ہے کہ اوروں کے ساتھ ساتھ کہیں
میں بھول جاؤں نہ خود کو بھی سرگرانی میں

میں جس کی راہ سجاتا رہا ستاروں میں
وہ آسماں ہی مجھے دے گیا نشانی میں

اب اس کے جسم پہ چھاؤں کی ایک دھجی ہے
جو دھوپ اوڑھ کے پھرتا رہا جوانی میں

خبر نہیں ، کہ وہ بے ساختہ ہنسا کیوں تھا
جب ایسی بات ہی کوئی نہ تھی کہانی میں

میں اپنے آپ سے ناراض ہوں ، مگر جمشید
نہیں کہ عمر ہی کٹ جائے بد گمانی میں

جمشید چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دن کنارے لگ گیا ، سورج کناری ہو گیا
صبح پیراہن ہوئی ، شامِ وصال اُس کے لیے

غزل

ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزری
زندگی ماں کے پاؤں میں گزری

تُو نے لوگوں کی بددُعائیں لیں
میری ساری دعاؤں میں گزری

مُجھ سے بھی وہ زیادہ بے بس تھے
عُمر جن بے نواؤں میں گزری

اس دیے کا مزاج پوچھتے ہو
جس دیے کی ہواؤں میں گزری

ہاتھ آگے زمیں کے جوڑتے ہیں
وہ کہ جن کی ہواؤں میں گزری

ایک ایسا بھی عہد گزرا ہے
دن کہیں ، شب سراؤں میں گزری

ہارون الرشید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی ، جان لیا البتہ

غزل

ہم ، کہ تقصیر کرنے والے ہیں
اُس پہ تدبیر کرنے والے ہیں

بولتے ہیں نہ سنتے ہیں ہم لوگ
اور تقریر کرنے والے ہیں

دیکھتے یوں ہیں شیخ رِندوں کو
جیسے تکفیر کرنے والے ہیں

کیا کریں اُن کی چارہ جوئی کہ جو
غم کی تشہیر کرنے والے ہیں

ہائے کچھ لوگ اپنے خوابوں کو
وقفِ تعبیر کرنے والے ہیں

اے مصور خوشا کہ نقش ترے
سبھی دل گیر کرنے والے ہیں

ہم ہمی ہیں، نظر بھی آئیں گے، بس
ذرا تاخیر کرنے والے ہیں

اب کے لگتا ہے وہ سحرؔ میری
پوری توقیر کرنے والے ہیں

حسنین سحرؔ

غزل

بغض ایسا دلوں میں بو بیٹھے
باہمی اعتماد کھو بیٹھے

خوب سے خوب تر کی خواہش میں
ہم میسر سے ہاتھ دھو بیٹھے

تم سے تھا سلسلہ تکلم کا
اور تم بھی کسی کے ہو بیٹھے

اس سے آگے ہے روشنی کا سفر
ہم اندھیروں پہ خوب رو بیٹھے

ہم بھی آ جائیں گے نظر تجھ کو
یہ ذرا وقتی گرد تو بیٹھے

جن کو سونا تھا جاگتے ہیں ابھی
جاگنا تھا جنھیں وہ سو بیٹھے

موڑ آیا ہے وہ کہانی میں
بین کرتے ہیں قصہ گو بیٹھے

عمر بھر اٹھ نہیں سکے ارشد
اس کی محفل میں آ کے جو بیٹھے

ارشد شاہین

غزل

فزکس کہتی ہے باہر بہت اندھیرا ہے
فقیر کہتا ہے اندر بہت اندھیرا ہے

بہت اندھیری شبوں میں چراغ جیسا میں
کھپا رہا ہوں بہت سر، بہت اندھیرا ہے

کھڑا ہوا ہوں گلی میں دریچہ کھول کے دیکھ
دکھا دے چہرہ ستمگر بہت اندھیرا ہے

اُجالے چھیل کے دیکھا کرو خریدتے وقت
چمکتی چیزوں کے اندر بہت اندھیرا ہے

چراغ روشنی دیتا ہے ساری بستی کو
مگر چراغ کے گھر پر بہت اندھیرا ہے

پہن کے عشق کی کھڑتال دل سے دھوپ نکال
دھمال ڈال قلندر بہت اندھیرا ہے

میں کر کے آیا ہوں آوارگی خلاؤں میں
بہت اندھیرا ہے اوپر بہت اندھیرا ہے

بہت گھنا ہے یہ عرفانِ ذات کا جنگل
جلاؤ مشعلِ ساغر بہت اندھیرا ہے

برونِ گنبدِ بے در کی کوئی بات کرو
درونِ گنبدِ بے در بہت اندھیرا ہے

تمھیں سنائی نہیں دے رہا اندھیرا کیا؟
بتا رہے ہیں یہ جھینگر بہت اندھیرا ہے

ڈبو نہ دے تجھے گہرائی ایک ایٹم کی
بہت ہی تجزیہ مت کر بہت اندھیرا ہے

مرے رسولؐ ہیں اس کائنات کی امید
بغیرِ نورِ مبشّر بہت اندھیرا ہے

میں ایک مصرعہ میں سمجھاتا ہوں اندھیرا تمھیں
سوائے اللہ اکبر بہت اندھیرا ہے

علی ارمان

غزل

سایہ دیوار سے بہتر ہے کہ چل سکتا ہے
دو گھڑی کے لیے پہلو تو بدل سکتا ہے

ایک پتھر جو اُٹھا کر میں چلا جاتا ہوں
یہ کسی وقت مرے پاؤں کچل سکتا ہے

تم چلی جاؤ مگر بچے یہیں رہنے دو
ان کھلونوں سے مرا دل تو بہل سکتا ہے

اے کنارے پہ کھڑے شخص! خوشی سے نہ اُچھل
دیکھ کر تجھ کو سمندر بھی مچل سکتا ہے

اپنے چہرے کو تُو آنکھوں ہی سے چُھو لینے دے
آتشِ گل سے مرا ہاتھ بھی جل سکتا ہے

یہ سمندر ہے سمندر، مرے دیاؤں سے
میرے دریاؤں کا رُخ کون بدل سکتا ہے

اپنی آنکھوں کو میں چھوڑ آیا ہوں چھت پر ناصرؔ
چاند کا کیا ہے؟ کسی وقت نکل سکتا ہے

ناصر بشیر

غزلیں

ہم کہ شب زاد تھے بن بن کے ستارے جاگے
ڈھل گئی رات کہیں نور کے دھارے جاگے

آتشِ وہم کہ جلتی ہی رہی دیر تلک
ہم بھی چپ چاپ کسی خوف کے مارے جاگے

ہم تھے وہ کارِ جہاں راس نہ آیا جن کو
ہم نے جو کام کیا اُس میں خسارے جاگے

شہر والے سبھی بیدار رہے صبح تلک
کچھ دعا پڑھتے ہوئے سارے کے سارے جاگے

سو گیا بخت سرِ شام کسی غم سے شفیق
ہم کسی اور تمنا کے سہارے جاگے

شفیق احمد خان

بھٹکی ہوئی حیات کا محور نہ تھا کوئی
ہر سو حصارِ یاس تھا اور در نہ تھا کوئی

پھرتا تھا اپنا کانچ کا پیکر لیے ہوئے
کل تک کسی کے ہاتھ میں پتھر نہ تھا کوئی

ظلمت بڑھی تو آنکھ کی بینائی چھن گئی
پھر دور تک نگاہ میں منظر نہ تھا کوئی

تو نے بھی میرے واسطے دنیا کو تج دیا
مجھ کو بھی تیری ذات سے بڑھ کر نہ تھا کوئی

میں ڈٹ گیا تو خوف کا بادل بھی چھٹ گیا
پھر آس پاس دل کے کہیں ڈر نہ تھا کوئی

رویا تو شب کو چین سے سویا رہا شفیق
دل میں کسی خیال کا نشتر نہ تھا کوئی

غزلیں

دیے جلاتے ہوئے راستہ دکھاتے ہوئے
میں چل رہی تھی کسی طور گنگناتے ہوئے

سُنا ہے تُو بھی اسی شہر میں ہے مدّت سے
کبھی تو مِل انہی راہوں پہ آتے جاتے ہوئے

گزر رہی جاتا ہے یہ وقت رات ہو یا سحر
کہا فلک سے ستاروں نے ٹمٹماتے ہوئے

جو دل دیا تھا مجھے دسترس بھی دے دیتا
تُو سوچتا تو سہی آرزو جگاتے ہوئے

کہاں سے خاک اُٹھائی تھی میری، کوزہ گرا
نمی تھی آنکھ میں تیری مجھے بناتے ہوئے

ہر ایک باب میں اک درد ہانٹ کرتا تھا
میں رو پڑی تھی اُسے داستاں سناتے ہوئے

شبہ طراز

گزارے کیسے کوئی اس قدر ڈرے ہوئے دن
قدم قدم پہ کئی حادثے دھرے ہوئے دن

نہ پوچھو ہم سے گزارا ہے کیسے ہجر یہاں
اُٹھاؤ لاش محبت کی، اور مرے ہوئے دن

بہت عجیب سے بے رنگ دن گزرتے تھے
بہار آئی تو گلشن میں پھر ہرے ہوئے دن

وہی جو یادوں میں رہتے ہیں زندگی بن کر
اندھیری راہ میں اِک روشنی کرے ہوئے دن

جو کھوٹے سکّوں کی طرح گزر رہے تھے کبھی
طلوع ہو گیا سورج، تبھی کھرے ہوئے دن

غزل

جدا تو ہونا ہے لڑنے کی کیا ضرورت ہے
تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے

کلاہِ عشق کی توقیر ہی نہیں باقی
تو اس میں آئنے جڑنے کی کیا ضرورت ہے

بس ایک سانس کی دوری پہ ہے مقامِ فنا
بلا وجوب اکڑنے کی کیا ضرورت ہے

تعلقات اگر توڑنا ہی ہیں تجھ کو
تو پھر بہانے بھی گھڑنے کی کیا ضرورت ہے

یہ خواب جگنو ہیں، راتوں کو کام آتے ہیں
سوان کو دن میں پکڑنے کی کیا ضرورت ہے

مجھے پتا ہے مقدّر ہے مہرباں تجھ پر
تو اس پہ اتنا اکڑنے کی کیا ضرورت ہے

کوئی تو بات ہے ایسی جو نبھ نہیں سکتی
وگرنہ ہم کو بچھڑنے کی کیا ضرورت ہے

مفاہمت بھی تجھے چاہیے اگر طالب
تو بات بات پہ اڑنے کی کیا ضرورت ہے

طالب انصاری

غزل

وہم کو ذہن سے نکال اے دل
مُفت کے وسوسے نہ پال اے دل

ان کے پاس ایک بھی جواب نہیں
رائیگاں ہیں ترے سوال اے دل

آج کا کام آج مت کرنا
حسبِ معمول کل پہ ٹال اے دل

نام پر اُس کے ترکِ زیبائش؟
جس کو محبوب ہے جمال اے دل

سوچنا ، سوچتے چلے جانا
طرحِ دیوانگی نہ ڈال اے دل

وہ جو سود و زیاں سے بالا ہے
اُس پہ آتا نہیں زوال اے دل

دل میں اک ذرۂ ملال نہیں
یہ محبت کا ہے کمال اے دل

جو نہیں مل سکا ، بھلا دے اسے
جو ملا ہے اسے سنبھال اے دل

صرف مہر و وفا کے باب میں ہو
کوئی دے جب تری مثال اے دل

اس سے پہلے کہ تو فنا ہو جائے
وقت اپنے لیے نکال اے دل

افشاں سجاد

غزل

یوں حسنِ فسوں ساز سے نالاں ہوا دل بھی
دنیا کی محبت سے گریزاں ہوا دل بھی

یادوں کو لیے سینۂ سوزاں میں ، جیے ہم
زخموں کو لیے غرقِ نمکداں ہوا دل بھی

چپ چاپ ہے، خاموش ہے، ویران پڑا ہے
تم جس سے گئے ، شہرِ خموشاں ہوا دل بھی

لیتا نہیں کوئی بھی اسے مفت ، جہاں میں
صد حیف! کہ بے وقعت و ارزاں ہوا دل بھی

معلوم نہیں ، بند کرے کب یہ دھڑکنا
جینے کا نہیں ، موت کا ساماں ہوا دل بھی

یوں صرصرِ ایام کی زد میں ہیں سبھی پھول
دیکھا جو اسے، ششدر و حیراں ہوا دل بھی

یادوں کا سجاتا ہے سرِ شام یوں میلہ
جیسا کہ کوئی حلقۂ یاراں ہوا دل بھی

دیتا ہے مجھے روز محبت کے نئے درس
دل ، دل نہ ہوا ، ایک دبستاں ہوا دل بھی

جب شام ڈھلے، اس کو کیا پیار سے رخصت
آنکھیں بھی ہوئیں نم تو پریشاں ہوا دل بھی

لیلائے محبت کی تمنا لیے ، شوکت
مجنوں کی طرح ، دشت میں رقصاں ہوا دل بھی

شوکت محمود شوکت

غزل

کچھ اُس سے گفتگو کرنے کی تیاری نہیں کرنی
کہ دانستہ کوئی بھی کیفیت طاری نہیں کرنی

''محبت کی کہانی میں اداکاری نہیں کرنی''
کہ ہرگز بات کوئی غیرمعیاری نہیں کرنی

تماشا دیکھنے کو آئے ہیں ہم تو دکانوں کا
ہمیں بازار سے کوئی خریداری نہیں کرنی

جہاں تک ہو سکے محفوظ رکھنا ہے بھرم اپنا
کہ اپنے ہاتھ سے پامال خودداری نہیں کرنی

محبت کے سبھی اسباق ازبر ہیں ہمیں یارو
برائے امتحاں کوئی بھی تیاری نہیں کرنی

زبان و لفظ پر رکھنا بہ ہرصورت گرفت اپنی
کہ محفل میں کسی کی بھی دل آزاری نہیں کرنی

نہیں کچھ فائدہ بے فیض لوگوں سے محبت کا
ہمیں بنجر زمینوں میں شجرکاری نہیں کرنی

ندیم اس طرح آ جاتی ہے منزل موت کی اکثر
کبھی حد سے زیادہ تیز رفتاری نہیں کرنی

ریاض ندیم نیازی

غزل

شور اندر کا بڑھا دیتا ہے کوئی اور بھی
میرے ہونے کا پتہ دیتا ہے کوئی اور بھی

اپنی سانسوں کا الاؤ راکھ کرتا ہے مجھے
آگ اس گھر میں لگا دیتا ہے کوئی اور بھی

گھر کے اندر اس قدر سائے کہیں سے آ گئے
بولتا ہوں میں صدا دیتا ہے کوئی اور بھی

میں ہواؤں کو فقط الزام دے سکتا نہیں
ان چراغوں کو بجھا دیتا ہے کوئی اور بھی

جنبشِ لب سے بکھرتا ہے چٹانوں کا غرور
راہ کے پتھر ہٹا دیتا ہے کوئی اور بھی

زلزلے سینے میں اُٹھتے ہیں قیامت کی طرح
نقش بنتے ہی مٹا دیتا ہے کوئی اور بھی

یہ زمیں ہے آسماں تک ہاتھ پھیلائے ہوئے
اے خدا تیرے سِوا دیتا ہے کوئی اور بھی؟

محمد نوید مرزا

غزل

آ دیکھ اپنے پھول پرانی بیاض میں
مرجھا گئی ہے میری جوانی بیاض میں

دل کے ورق ورق پہ رقم ہے اسی کا نام
موجود ہے بیاض کا بانی بیاض میں

یہ راکھ میرے گل شدہ جذبوں کی راکھ ہے
رکھی ہے جو بطور نشانی بیاض میں

اوراق خود بخود ہی تلف ہو گئے کہیں
لکھی تھی ہم نے دل کی کہانی بیاض میں

لفظوں سے آ رہی ہے کسی زلف کی مہک
کھلنے لگی ہے رات کی رانی بیاض میں

نم خوردہ کیسے ہو گئے کاغذ حیات کے
گرنے نہیں دیا کبھی پانی بیاض میں

اک لفظ بھی ادھر سے ادھر جا نہیں سکا
ہوتی نہیں ہے نقل مکانی بیاض میں

برتے ہیں کیسے کیسے ردھم ہم نے امتیاز
ہے موج موج غم کی روانی بیاض میں

امتیاز الحق امتیاز

غزل

نشان رکھتے ہوئے بے نشان بیٹھے ہیں
تمھاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

حصولِ منزلِ مقصود رائیگاں ٹھہری
وفورِ شوق کی ہر راہ چھان بیٹھے ہیں

اُداسی ، رنج و الم اور فراق کی صورت
ہمارے دل میں بہت مہربان بیٹھے ہیں

صلہ ملا ہی کہاں ہم کو اس رفاقت کا
غضب کیا جو تمھیں اپنا مان بیٹھے ہیں

اب ان سے مہر و مروّت کی بات کیسے ہو
لیے جو ہاتھ میں تیر و کمان بیٹھے ہیں

تلاشِ رزق سے لوٹے ہیں یہ پرندے بھی
تھکے ہوئے سے جو بھر کر اُڑان بیٹھے ہیں

گلہ کریں بھی تو کیا اُن سے بے نیازی کا
بڑھا کے ہم بھی تو اپنی دکان بیٹھے ہیں

نہ جانے ہوگا کہاں سائباں نصیب ہمیں
وفا کے دشت میں ہم بے امان بیٹھے ہیں

نہ جانے کون سے تو آسماں پہ بیٹھا ہے
اک آسمان پہ چھے آسمان بیٹھے ہیں

کسی پہ رازِ دل افشا نہ ہو کہیں افروز
"چھپائے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں"

افروز رضوی

غزل

ہم ان کو فقط اپنا بنانے میں لگے ہیں
اور وہ ہیں کہ دنیا میں، زمانے میں لگے ہیں

اُتنا ہی ہُوا جاتا ہے وہ آپے سے باہر
جتنا ہی اسے ہم کہ منانے میں لگے ہیں

ویسے ہی وہ خاطر میں مجھے لاتا نہیں ہے
اوپر سے سبھی اس کو سِکھانے میں لگے ہیں

تب ان سے بھلا صلح کی امید ہو کیسے
جب رائی کا پربت وہ بنانے میں لگے ہیں

جب سب ہی اندھیروں کے پجاری ہیں یہاں پر
کیوں آپ چراغوں کو جلانے میں لگے ہیں

میں ان کے لئے ایک غزل لکھنے کا خواہاں
وہ ہیں کہ مرے ہوش اڑانے میں لگے ہیں

اس ہوش ربا حسن کو آپ اتنا سجا کر
دل والوں میں کیوں حشر اٹھانے میں لگے ہیں

جب سے ہے سنا آنے کو ہیں وہ "ذکی طارق"
ہم تب سے ہی گھر اپنا سجانے میں لگے ہیں

ذکی طارق

غزل

ویسے تو ہر کسی کو ٹھکانا عزیز ہے
ہم کو تمہارے شہر میں آنا عزیز ہے

تنہائیاں عزیز ہیں ہم کو، یہ ہے بجا
اور ہجر تو بہت ہی پرانا عزیز ہے

ہم بے نیاز لوگ ہیں، مت چھیڑیے، ہمیں
دنیا عزیز ہے، نہ زمانہ عزیز ہے

لازم ہے نازنین کے نخرے اٹھائیں ہم
جب دل نے ایک شخص کو مانا عزیز ہے

اہلِ ہنر کو فن کی ستائش سے ہے غرض
دولت عزیز انہیں، نہ خزانہ عزیز ہے

پتھر اٹھائے پھر رہے ہیں لوگ شہر میں
اور کہہ رہے ہیں آئنہ خانہ عزیز ہے

آصفؔ انہیں یقین حقیقت پہ کچھ نہیں
یہ لوگ وہ ہیں جن کو فسانہ عزیز ہے

آصف شفیع

غزل

یاد اُس کی لو اب چلی آئی
پھر بھی چاروں طرف ہے تنہائی

جگنوؤں کی طرف لپکتا ہے
ہو گیا سارا شہر سودائی

چاندنی سو گئی ہے چپکے سے
رات لینے لگی ہے انگڑائی

دیکھتے دیکھتے ترا رستہ
اب تو آجا کہ آنکھ پتھرائی

وہ ہے سورج تو کس طرح دیکھوں
چھین لے گا وہ میری بینائی

خود کو فوزیؔ چھپائے پھرتی ہوں
میری شہرت ہے اسکی رسوائی

فوزیہ تبسم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا خبر گاؤں کا ہر گھر ترے گھر جیسا ہو
یہی باتیں کبھی چوپال میں کر دیکھیں گے

غزلیں

محبت کا یہ کیسا سلسلہ ہے
زمیں تک آسماں پھیلا ہوا ہے
تمہاری دھڑکنوں کو کیا ہوا ہے
ہمارا تو یہ پہلا تجربہ ہے
ہمارے نقش تو بگڑے نہیں ہیں
تمہارا آئنہ ٹوٹا ہوا ہے
مری شاخیں ہری ہونے لگی ہیں
کسی جنگل نے مجھ کو آ لیا ہے
ازل سے منزلوں کی جستجو میں
ازل سے آدمی بھٹکا ہوا ہے

ہوائے شام کا جرار لشکر
چراغ شام سے الجھا ہوا ہے
کوئی مے خوار گزرا ہے یہاں سے
جبھی تو راستہ بہکا ہوا ہے
عجب سا خواب میں دیکھا ہے منظر
کہیں چھتری، کہیں خیمہ لگا ہے
ترے رخسار پہ رکھا تھا شاہد
ہمارا ہاتھ جو مہکا ہوا ہے

افتخار شاہد

درد کچھ اور بڑھا آپ کے آجانے سے
ہم کو رخصت نہ ملی اب بھی شفاخانے سے

ایک مدت مَیں ترے لمس کی شدت میں رہا
چھو گیا ہاتھ ترے ہاتھ کے دستانے سے

اس نے بھی طرز تکلم کو سنبھالے رکھا
میں بھی ڈرتا ہی رہا بات کے بڑھ جانے سے

ورنہ میں ہاتھ پہ کرنے ہی لگا تھا بوسہ
خواب ٹوٹا ہے مگر آپ کے گھبرانے سے

ٹھوکریں کھا کے بھی پلٹیں تو غنیمت جانو
کون سمجھا ہے یہاں بات کے سمجھانے سے

ہم کو حاجت ہی نہیں جام و سبو کی ورنہ
روز آتا ہے بلاوا کسی مے خانے سے

پہلے کچھ روز تو حیرت سے مجھے دیکھتے تھے
اب تو مانوس ہیں رستے ترے دیوانے سے

غزل

خواب جو ٹوٹے ہیں تیرے غم کی طغیانی کے ساتھ
کرچیاں نکلی ہیں میری آنکھ سے پانی کے ساتھ

قدر تیری کھو نہ دے وہ فطری نادانی کے ساتھ
تُو میسر آ گیا ہے جس کو آسانی کے ساتھ

چاند میرے ساتھ شب بھر جاگتا ہے ہجر میں
تیری خوشبو جاگتی ہے رات کی رانی کے ساتھ

ہم فقیروں کا پتا ایسا کوئی مشکل نہیں
ایک ہی کٹیا بچی ہے قصرِ سلطان کے ساتھ

تیرے گھر کے راستے میں جتنے بھی اشجار ہیں
روز مجھ کو دیکھتے تھے فرطِ حیرانی کے ساتھ

آب سے، پھر اشک سے، پھر آبِ زم زم کے دُھلے
داغ بھی دل کے گئے ہیں آج تک پانی کے ساتھ؟

یاد سینے سے نہ نکلی اور نہ نکلا دل سے تو
دل کو ہر لحہ لگایا لوحِ قرآنی کے ساتھ

اِک شبِ ہجراں نہیں گزری، گزاری بار بار
سو جتن بھی کر کے دیکھے میں نے دیوانی کے ساتھ

دونوں آنکھیں میں نے تیری راہ میں روشن رکھیں
اِک دیا خوں سے جلایا اِک دیا پانی کے ساتھ

تو مضافاتی علاقے کا ہے بنجارا میاں!
تیرا ساگر میل کیا لاہور کی رانی کے ساتھ

محمد سلیم ساگر

غزل

بیک وقت اپنے ماضی، حال، مستقبل میں رہتے تھے
خدا رہتا تھا ہم میں، ہم خدا کے دل میں رہتے تھے

جنھیں در کی طرح تھی چار دیواری عناصر کی
وہ بندے بھی اِسی دنیائے آب وگل میں رہتے تھے

جہاں ہم تھے، وہاں سے لامکاں نزدیک پڑتا تھا
ہم اپنی بے گھری کی آخری منزل میں رہتے تھے

رواں رہتی تھی ہر لحظہ لہو میں لہر دہشت کی
کہ ہم بستی بنا کر دامنِ ساحل میں رہتے تھے

شریکِ بحث رہتے ہم اِدھر سے بھی اُدھر سے بھی
کہیں کے جب نہ رہتے تو حدِ فاصل میں رہتے تھے

عجب مزدُور تھے ہم زندگی کی کارگاہوں میں
بناتے تھے سہولت اور خود مشکل میں رہتے تھے

بدلتا تھا فراق اوروں کے دل میں کینچلی اپنی
یہاں کے سانپ اکثر دوسروں کے بل میں رہتے تھے

بُرا کہتے نہیں تھے اس لیے دنیا کو ہم شاہد
ہزاروں حق پرست اس قریۂ باطل میں رہتے تھے

شاہد ماکلی

غزلیں

زمانے کا غلط انداز کیوں ہے
یہاں ہر شخص دھوکے باز کیوں ہے

کسی نے کیا مجھے پھر سے پکارا
ترے جیسی کوئی آواز کیوں ہے

میں روزانہ بہت جلدی سے سوئی
سہانا خواب جانے شاذ کیوں ہے

محبت کیا سپردِ خاک کر دوں؟
بھٹکتی روح بے پرواز کیوں ہے

نہ رکھنا آیا جب دل ہی کسی کا
تو پھر اس افسری پہ ناز کیوں ہے

کئی برسوں سے یکباری نہ پوچھا
کوئی تم سے بھلا ناراض کیوں ہے!

رخشندہ نوید

یہ کیسی سرسوں کے مانند پھر سے پیلی ہوئی
تو کیا گرفت تری زندگی پہ ڈھیلی ہوئی

بدل رہی ہے کئی رنگ آسمان کی چھت
سفید، سرمئی، پیلی کبھی یہ نیلی ہوئی

مرے مکاں کے برابر مکان کی دیوار
ہوئی جو نم تو اِدھر اینٹ اینٹ گیلی ہوئی

سڑک پہ دیکھا ہے اک حادثے کو ہوتے ہوئے
کہیں کہیں سے مری جلد بھی ہے چھیلی ہوئی

کوئی تو رنج تھا، دل میں کہیں چھپایا ہوا
ذرا سی بات بھی ماچس کی ایک تیلی ہوئی

زمانہ رونے سے کرنے لگا اسے موسوم
زمینِ چشم، اگر بھول کر بھی گیلی ہوئی

غزل

میرے لفظوں کو وہ اظہار میسر آئے
میری خوشبو مرے دشمن کو بھی چھو کر آئے

کاش ایسا بھی کوئی آنکھ میں منظر آئے
چاند بڑھ کر ترے سائے کے برابر آئے

میرے اندر کے نہ توڑے در و دیوار ابھی
درد سے کہہ دو مری آنکھ سے باہر آئے

ایک میں ہوں کہ مرے ہاتھ ہیں خالی اب تک
ایک تو ہے کہ ترے ہاتھ سمندر آئے

کوئی دشمن مرے معیار پہ اترا ہی نہیں
مجھ سے لڑنے کے لیے کوئی سکندر آئے

کچھ تو نیچے ہوں امیروں کے فلک بوس مکان
اس بڑے شہر میں کچھ دھوپ تو سر پر آئے

چاندنی ہے تو بکھر جائے مرے چاروں طرف
وہ اگر رنگ ہے تو پھول سے باہر آئے

عین ممکن ہے کبھی رات کو تنہا پا کر
تم سے ملنے کے لیے چاند اتر کر آئے

جس میں موجود تھا ہنستا ہوا پیکر تیرا
میری آنکھوں میں پھر اک بار وہ منظر آئے

اشرف کمال

غزل

اس بڑے بازار میں بھی گرم بازاری نہیں
کیا تمہارے شہر میں خوئے خریداری نہیں

ہم فقیروں سے کسی کی دوستی یاری نہیں
غم زدوں کے ساتھ کرتا کوئی غم خواری نہیں

ممتحن سے مشورہ کرنا پڑے گا دوستو!
امتحانِ عشق ہے اور اپنی تیاری نہیں

پھر اٹھا لائے ہیں بوتل آپ میرے واسطے
میں نے بولا بھی تھا مجھ کو راس میخواری نہیں

دشمنوں سے بھی ہے میرے دوستوں کا رابطہ
یہ وفاداری نہیں ہے، یہ طرف داری نہیں

نیند بھی آتی نہیں ہے رہزنوں کے خوف سے
گھر تو اپنا ہے پہ گھر کی چار دیواری نہیں

خاک زادہ ہوں مجھے ہے عشق اپنی خاک سے
یار میں نوری نہیں ہوں، یار میں ناری نہیں

بھول کر بھی ہم وہاں جاتے نہیں انصر حسن
جس جگہ ہوتی ہماری ناز برداری نہیں

انصر حسن

غزلیں

ہمارا عشق بھی، سمجھی کہ بس خیالی ہے
اسی لئے تو میں کہتا ہوں تُو نرالی ہے

کبھی تو آنکھ ملا کر بھی بات کر مجھ سے
یہ تو نے بیچ میں دیوار کیوں اٹھا لی ہے

تو اپنے آپ سے باہر کبھی نہیں نکلی
وگرنہ ایک زمانہ ترا سوالی ہے

یہ زندگی بھی ترے بعد اک سکوت میں ہے
جہاں پہ چھوڑ گئے تھے وہاں نبھا لی ہے

پڑی ہوئی تھی جو رستے میں تیرے پاؤں کی دھول
وہی سمیٹ کے دنیا نئی بنا لی ہے

عمران اعوان

ہنستے چہرے پہ بھی قرار نہیں
اسطرح زندگی گزار نہیں
تو نے ہر بار جھوٹ بولا ہے
تیری باتوں کا اعتبار نہیں
تو یہاں وقت پاس کرتا ہے
مجھ کو معلوم ہے: یہ پیار نہیں
تیرا ہر سال اک کہانی ہے
میرا لمحوں میں بھی شمار نہیں
میں پسِ بام دیکھ سکتا ہوں
صرف آنکھوں پہ انحصار نہیں

تیری آنکھوں میں ہو بھی سکتا ہے
میرے چہرے پہ تو غبار نہیں
تو مجھے کب کا بھول بیٹھا ہے
اور مجھے تیرا انتظار نہیں
زندگی سے فرار ممکن ہے
ہجر کی راہ سے فرار نہیں

غزلیں

مری دسترس میں جو پھول تھے وہ جھلس گئے
مرے بام و در تری خوشبوؤں کو ترس گئے

مرے خواب زار اجاڑ کے، مجھے مار کے
کہاں خاک اوڑھ کے سو رہے، کہاں بس گئے

وہ جو سبز رت کے سحاب تھے جو گلاب تھے
مرے دل کی دھرتی پہ آگ بن کے برس گئے

وہ ترے فقیر کی جھونپڑی ہے یہیں کہیں
وہ بلند بام عمارتیں ، وہ کلس گئے

ترے بعد کوچۂ دلبراں کا یہ حال ہے
سرِ رہگزارِ سلوک اہلِ ہوس گئے

میں عجیب حالتِ ہجر کے ہوں حصار میں
نہ تو کھل کے برسیں ہیں بارشیں نہ امس گئے

نہ تو اب وہ کونجوں کی ڈار ہے نہ قطار ہے
عجب آندھیاں ہیں کہ آشیان و قفس گئے

اصغر علی بلوچ

ایک بے وجہ اداسی لیے خوش رہتا ہوں
میں ترے ساتھ خموشی لیے خوش رہتا ہوں

رات اور دن کے تعاقب میں بسر ہوتی ہے
میں عبث خواہشِ باقی لیے خوش رہتا ہوں

یوں بھی ہوتا ہے کہ میں روتے میں ہنس دیتا ہوں
اور اک صدمہ اضافی لیے خوش رہتا ہوں

میں تغیر کو بھی تقدیر سمجھتا ہوں اے دوست
سو ترے ہجر کی تختی لیے خوش رہتا ہوں

سر پہ میں دار سجاتا ہوں کہ سردار ہوں میں
پاؤں میں جبر کی رسی لیے خوش رہتا ہوں

کرب سے دیکھتی رہتی ہیں وہ بوڑھی آنکھیں
اور میں عالمِ طفلی لیے خوش رہتا ہوں

اور کیا رہ گیا خوش رہنے کو باقی اصغر
میں فقط شعر کی مستی لیے خوش رہتا ہوں

غزلیں

جب سفینہ کسی منجدھار میں آ جاتا ہے
کوئی رخنہ مری پتوار میں آ جاتا ہے

غم جو الفاظ کی بندش میں نہیں آ سکتا
چُپ کے پیرایۂ اظہار میں آ جاتا ہے

سنگ چُھوا دیئے جب اُس نے جھروکے کی جگہ
اُس کا چہرہ مری دیوار میں آ جاتا ہے

بدنصیبی سے اگر بُھوک گلے پڑ جائے
گھر کا سامان بھی بازار میں آ جاتا ہے

اُس کو رہتا ہے مرے سامنے آنے سے گریز
یہ الگ بات کہ اشعار میں آ جاتا ہے

تصدق شعار

لُطف تو کیا کہ سلامِ سرِ راہے بھی نہیں
تیری دنیا میں ہم ایسے پرِ کاہے بھی نہیں

دارِ الفت پہ معلق ہیں بڑی دیر سے ہم
وہ گُریزاں جو نہیں ہے تو ہے چاہے بھی نہیں

اور تو بندشِ الفاظ سے ہے کیا حاصل
اِس ریاضت کو اگر کوئی سراہے بھی نہیں

حال اُس چشمِ فُسوں ساز کا کیا پوچھتے ہو
مہرباں ہوتی ہے گاہے، کبھی گاہے بھی نہیں

زندگی موت کو رستہ بھی نہیں دیتی ہے
اور کبھی اپنے تقاضوں کو نباہے بھی نہیں

غزل

صدیوں آنکھوں سے لگایا ہوا شخص
ہائے وہ شخص ، گنوایا ہوا شخص

اِس پہ بنتا ہے بہت سا ماتم
ہنس پڑا تیرا رُلایا ہُوا شخص

کون پونچھے گا مرے اشکوں کو
مَیں ہُوں خود اپنا ستایا ہُوا شخص

چاند کو دیکھ کے یاد آتا ہے
چودھویں شب میں گنوایا ہُوا شخص

ایک دن پھوٹ بہا آنکھوں سے
دل کے آنگن میں لگایا ہُوا شخص

جھوٹ بکتے ہیں زمانے والے
بُھولتا کب ہے بُھلایا ہُوا شخص

میری فُرصت کو عطا کر، یارب !
اپنی فُرصت میں بنایا ہُوا شخص

کیوں جھلک بھر بھی نظر آتا نہیں؟
میرے دن رات پہ چھایا ہُوا شخص

مُجھ سے ملیے، مَیں وہی فارسؔ ہُوں
آپ کے ہجر کا کھایا ہوا شخص

رحمان فارس

غزل

جب ہم طریقِ لذتِ ابہام تک گئے
بندِ قبائے زینتِ آرام تک گئے

اک جسم کے الاؤ کے کہرام تک گئے
دل کو کہاں سے روکتے، انجام تک گئے

خوشبو اسی کی ذہن کے آنگن میں بس گئی
سوچوں کے سارے زاویے گلفام تک گئے

ہم کو سوات وادی کا جس نے پتہ دیا
اس مہ جبیں کو ڈھونڈنے کالام تک گئے

کس خیرگی کو ماپنے کا شوق تھا کہ ہم
جب دامنِ دریدۂ مادام تک گئے

نا آشنا خوشی تھی تو واقف ملال تھا
ملنے کو دوستوں سے بھی دشنام تک گئے

سچائیوں کے جسم پہ اک جھوٹ اوڑھ کر
خلقت کے ساتھ ساتھ یہ خدام تک گئے

تہذیب تھی نہ عقلِ سلیم اپنے بس کی تھی
سو گفتگو میں درجۂ ہنگام تک گئے

بستی کے ناموں سے ذرا یہ تو پوچھیے
توقیر کیسے خلعتِ بدنام تک گئے

توقیر شریفی

غزل

کشتیاں ٹوٹی ہوئیں پتوار ہیں سہمے ہوئے
مفلسی ایسی درو دیوار ہیں سہمے ہوئے

ہم کہاں جائیں بھلا کس سے کریں فریاد ہم
زندگانی کے یہاں آثار ہیں سہمے ہوئے

پھول خوشبو رنگ اُڑنے کے لئے تیار ہیں
کیسی ویرانی ہے یہ گلزار ہیں سہمے ہوئے

گر یہی حالت رہی تو کیا بنے گا دوستو
آج کل تو صاحبِ ایثار ہیں سہمے ہوئے

وقت یہ بھی آنا تھا اِک دن ہمارے سامنے
کیا بتاؤں میں مرے اغیار ہیں سہمے ہوئے

ایسی کیفیت کا کیسے تذکرہ ہو گا بھلا
یہ ہمارے دور کے فنکار ہیں سہمے ہوئے

اس طرف کوئی توجہ کر نہیں پایا کبھی
اس دیارِ پاک کے نادار ہیں سہمے ہوئے

کیا قیامت کا زمانہ آنے والا ہے یہاں
گلیاں سونی سونی ہیں بازار ہیں سہمے ہوئے

بڑھ رہے ہیں رفتہ رفتہ خودکشی کے واقعات
رونقیں غارت ہوئیں گھر بار ہیں سہمے ہوئے

مسخ ہوکر رہ گئی تاریخ تک گلزار کی
رنگ پھولوں کا اڑا ہے خار ہیں سہمے ہوئے

یہ مسلمانوں کی حالت ہوگئی ہے عابدی
مسجدیں ویران ہیں مینار ہیں سہمے ہوئے

علی حسین عابدی

غزل

کوئی لمحہ نہیں ، اس کو سوچا نہیں
اک زمانہ ہوا جس کو دیکھا نہیں

ایک مدت ہوئی وہ بھی بے چین ہے
ایک عرصہ ہوا مَیں بھی سویا نہیں

جو مجھے یاد آتا رہا دم بدم
بھول سکنے کا اس کو بھی یارا نہیں

لوگ ملتے رہے اور بچھڑتے رہے
ایک وہ، ہاں وہی، مجھ سے ملتا نہیں

اس کی آنکھوں نے وہ داستانیں کہیں
میں نے پلکوں کو تاحال جھپکا نہیں

اس شجر پر تو جتنے بھی پھل پھول تھے
میرے حصے کے تھے، میں نے جانا نہیں

اس کی آنکھوں میں تھی اک الگ روشنی
چاند تارہ کوئی یوں چمکتا نہیں

جو بھی اس نے کہا ، جو بھی میں نے کہا
وہ بھی جانا نہیں ، میں بھی سمجھا نہیں

میں حبیب اپنے بارے میں اور کیا کہوں
میرے کردار میں کوئی رخنہ نہیں

بشیر احمد حبیب

غزلیں

اُسے بھی، جو غیروں کو چاہت میں رکھے
خدا سب کو اپنی حفاظت میں رکھے

کلاسیکی میں نے ادب پڑھ رکھا ہے
یہی بات مجھ کو سہولت میں رکھے

مرا رزق اُس نے جو قسمت کیا ہے
وہ کچھ اس کا حصہ قیامت میں رکھے

کہیں ہم محبت پہ قائل نہ کر لیں
ہمیں اس لئے وہ عداوت میں رکھے

خدایا! سدا اس کو محتاج رکھنا
ہمیں یاد جب وہ ضرورت میں رکھے

فخر عباس

چلتا ہی جا رہا ہے وہ دیوانہ، مست ہے
راہیں کھلی ہوئی ہیں کہ منزل پرست ہے

حیلہ گری میں کٹ گئی حیلہ گروں کی شب
جانا ہے جس کو، دیر سے سامان بست ہے

کم لگ رہی ہیں راہ کی ساری رکاوٹیں
عالی ہے جب سے حوصلہ، دیوار پست ہے

پاکیزہ دل سے آتا ہے آنکھوں میں نور بھی
روشن دماغ ہے تو وہ تنویر دست ہے

پورے یقیں سے بھیجئے سانسوں کا قافلہ
بے جان زندگی میں بھی امکان ہست ہے

قابل نہیں ہے دوستی کے اس لحاظ سے
دل کے معاملے میں وہ حد درجہ خست ہے

سارے سخن شناس نہیں ہیں، جو آئے ہیں
بعد از مشاعرہ بھی کوئی بند و بست ہے!

غزلیں

آباد ہے تاریخ پرانی نہیں رکھتا
یہ شہر عجب ہے کہ کہانی نہیں رکھتا

لوٹا دیا ہر زخم گلابوں سی ردا میں
دل ساتھ کوئی اس کی نشانی نہیں رکھتا

آنکھوں کو عطا کرتا ہے بس عکس کی خیرات
وہ اپنی مثال آپ ہے ثانی نہیں رکھتا

ان ہونٹوں نے مفہوم کو پوشاک عطا کی
کہتے تھے کہ یہ لفظ معانی نہیں رکھتا

ہر بات رضا پھول کی پتی سی ادا کی
واعظ ہوں مگر شعلہ بیانی نہیں رکھتا

رضا اللہ حیدر

ہوا کے ہاتھ میں اپنا ہُنر نہیں دیتے
کبھی بگولوں کے رہنے کو گھر نہیں دیتے

عجیب موسمِ بے کیف ہے خیالوں میں
مہکتے پھول بھی لطفِ سحر نہیں دیتے

ہیں چیدہ کشفِ حقیقت جنھیں نصیب ہوا
جو کور ذوق ہوں ان کو نظر نہیں دیتے

ہمارے ہاتھ ہیں پتوار کی کلائی پر
اگرچہ راستہ اب بھی بھنور نہیں دیتے

رضا ہیں اور کئی منزلیں نگاہوں میں
نظر کا ساتھ مگر بال و پر نہیں دیتے

غزل

دیکھے گا کون کون ستارے کی آنکھ میں
منظر بدل رہا ہے نظارے کی آنکھ میں

ابروں کی باقیات پہ جلتا چراغ ہے
ٹھہری ہوئی ہے بوند جو گارے کی آنکھ میں

ان عشرتوں سے دید ہٹا کر تو دیکھیے
کتنی قناعتیں ہیں گزارے کی آنکھ میں

مانو ! بہت بلند ہے نالوں کا حوصلہ
اشکوں میں ضم ہوئے ہیں اجارے کی آنکھ میں

ڈوبا سرِ بھنور تو تہہِ آب جا رکا
ابھرا تو جا لگے گا کنارے کی آنکھ میں

لا ناں کبھی سمیٹ کے بے دست کے یہاں
جو گفتگو پڑی ہے اشارے کی آنکھ میں

تفسیر کے کواڑ پہ دستک تو دو ذرا
ہر آگہی کا طاق ہے پارے کی آنکھ میں

ساگر نئے فراق کا آنسو بہا گیا
تنکا جو تیرتا تھا سہارے کی آنکھ میں

ساگر حضور پوری

غزل

جفا کی رُت ہے یہاں کب وفا کا موسم ہے
یہ نفرتوں کی اُبھرتی وبا کا موسم ہے

کوئی بھی اپنی طرف سے نہ کر سکا تبدیل
یہاں ہر ایک ہی موسم، خدا کا موسم ہے

وہ کھینچتا ہی نہیں، ہاتھ نعمتوں سے کبھی
شبانہ روز ہی اُس کی عطا کا موسم ہے

بھنور کے پاس اگر ناؤ آگئی تو کیا
بھنور کے گرد کسی ناخدا کا موسم ہے

بہت سی اور خزائیں ہیں حُسن کی جڑ میں
ابھی تو عشق میں یہ ابتدا کا موسم کا

شبِ وصال کی ورشا، اُتر بھی صحن میں اب
یہ حبس ہجر تو اک انتہا کا موسم ہے

میں اہلِ حسن کی نظروں سے بچ کے چلتا ہوں
کہ ہر نگاہ میں تیکھی ادا کا موسم ہے

اُڑے ہوئے ہیں فضا میں سیاہ تر گیسو
بغور دیکھیے، کالی گھٹا کا موسم ہے

متاعِ عشق زمانے میں جس کو حاصل ہو
اُسی کے واسطے ٹھنڈی ہوا کا موسم ہے

کتھا میں نور جہاں کا بھی ذکر آئے گا
ابھی انار کلی کی وفا کا موسم ہے

پنپ رہی ہے غزل آفتاب کے دم سے
غزل گروں میں اُسی کی نوا کا موسم ہے

آفتاب خان

غزل

اسیر یونہی نہیں سب مری فغاں کے ہیں
سنا رہا ہوں جو دکھڑے اسی جہاں کے ہیں

مرا سکوت نہیں بے سبب مرے بھائی!
کہ زخم کھائے ہیں جتنے سبھی زباں کے ہیں

یہ آنکھ ہوتی نہیں منظروں سے کیوں مانوس
یہ ارد گرد مرے لوگ سب کہاں کے ہیں

کمال حوصلہ درکار ہے بلا کا ضبط
گزر رہے ہیں جو لمحات امتحاں کے ہیں

دکھائی دیتا ہے جو چار سو حقیقت ہے
کہ انتشار میں اوراق داستاں کے ہیں

یہ خستگی در و دیوار کی بتاتی ہے
مکیں کے جتنے بھی دکھ تھے وہ اب مکاں کے ہیں

گزر چکے ہیں جو دن قیمتی ہیں میرے لیے
جو دل پہ ثبت ہیں سب نقش رفتگاں کے ہیں

واصف سجاد

غزل

روزِ اوّل سے یہی کرتا رہا ہے آدمی
سوچتا کم اور زیادہ بولتا ہے آدمی

ہے یہ قاصر اپنے چہرے کو بدل سکتا نہیں
آئینہ ہر زاویہ سے دیکھتا ہے آدمی

کون سی منزل ہے اِسکی اور جانا ہے کہاں
نت نئے رستوں پہ چلتا جا رہا ہے آدمی

ہے کِسی کا اِنتظار اِسکو یا اِسکا خبط ہے
یا ہر اِک آہٹ پہ رسماً چونکتا ہے آدمی

آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہئے
قول سے اپنے ہی کب کا پھر چُکا ہے آدمی

حرکت وسکنات زِندہ ہیں نیازؔ اِس میں مگر
سچ تو یہ ہے جانے کب کا مَر چُکا ہے آدمی

نیاز جیراجپوری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیسی میٹھی مہم محبت تھی
شعر ، فنِ خطوط کاری ہے

غزلیں

صدا جب اس نے لگائی تھی تب ملا تھا اسے
اور اب وہ بھول گیا ہے کہ کب ملا تھا اسے

اِس اک خسارے میں اس کو ہزار فائدے تھے
مرے بغیر زمانے میں سب ملا تھا اسے

وہ ایک زاویے سے ہی سبھی کو دیکھتا ہے
میں جانتا ہوں بہت بے سبب ملا تھا اسے

عیوب چادرِ منطق سے ڈھانپ لیتا ہے
جو کہہ رہا ہے کہ میں بے طلب ملا تھا اسے

دمِ وداع کا منظر بھی میں نہیں بھولا
اسے تو یہ بھی نہیں یاد جب ملا تھا اسے

میں چاہتا تھا کہ سارے حجاب اٹھ جائیں
بغیر نام و نمود و نسب ملا تھا اسے

بجائے موجۂ جذبات مانگتا تھا دلیل
لگا کے ذہن میں جاذبؔ نقب ملا تھا اسے

اکرم جاذب

شہر کیوں خوش نظر نہیں آیا؟
کیا کوئی خواب گر نہیں آیا

بانجھ دھرتی کا دکھ سمجھتا ہے
اس شجر پر ثمر نہیں آیا

پیسہ ہاتھ آیا ماں نہیں رہیں جب
وقت بھی وقت پر نہیں آیا

شاعری اکتساب ہے تو کیوں
سیکھنے سے ہنر نہیں آیا

اس طرح مل رہے ہیں گھر والے
جیسے میں اپنے گھر نہیں آیا

میں اسے دیکھنے گیا جاذبؔ
اور پھر لوٹ کر نہیں آیا

غزل

کیا پوچھتے ہو کیوں مرا ایسا ہوا ہے جسم
غفلت کی ایک سانس سے مُردہ ہوا ہے جسم

ممکن ہے میری شکل و شباہت بدلتی جائے
اُڑتے ہوئے غبار میں رکھا ہوا ہے جسم

دن میں بہت سمیٹ کے خود کو رکھا مگر
ہوتے ہی رات فرش پہ بکھرا ہوا ہے جسم

شب بھر کسی خیال میں اُلجھا رہا ہوں مَیں
وقتِ سحر اُٹھا ہوں تو ٹوٹا ہوا ہے جسم

محسوس ہو رہی ہے کسی کی کمی مجھے
لگتا ہے چند روز سے جاگا ہوا ہے جسم

مرنے سے قبل خاک اُڑاتا رہا ہوں مَیں
مرنے کے بعد خاک میں لپٹا ہوا ہے جسم

اک عمر خود کو آگ لگائی ہے تب ظہور
مُردہ جو ہو گیا تھا وہ زندہ ہوا ہے جسم

ظہور چوہان

غزل

کوئی جانِ جاں نہ دکھائی دے، کوئی مہرباں نہ دکھائی دے
صفِ دوستاں میں مجھے یہاں کوئی رازداں نہ دکھائی دے

مرے پیش رو جو تھے گام زن اسی راہ پر وہ کہاں گئے
یہ عجب نہیں ہے کہ راستے میں کوئی نشاں نہ دکھائی دے

رہِ عشق پر یہ بھی وقت تھا کہ ہجوم عاشقاں بے شمار
یہ کیا ہوا ہے کہ اب مجھے کوئی کارواں نہ دکھائی دے

مجھے جس سے کوئی طلب نہ تھی وہی ساتھ میرے کھڑا رہا
میں لڑا تھا جس کے لیے یہاں وہی مہرباں نہ دکھائی دے

وہ غلط تھے یا کہ درست تھے میں انہی کے حق میں تھا بولتا
مرے حق میں میرے ہی دوستوں کا کہیں بیاں نہ دکھائی دے

مرے پرکھوں کا ہے جو راستہ، میں اسی پہ رہتا ہوں گام زن
کوئی غمزدہ نہ رہے یہاں، کوئی ناتواں نہ دکھائی دے

سید فرخ رضا ترمذی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نشیں ہم بھی تھے، لیکن لکھ نہ پائے آج تک
ایک سطرِ نُو نمود و نُو جمال اُس کے لیے

غزل

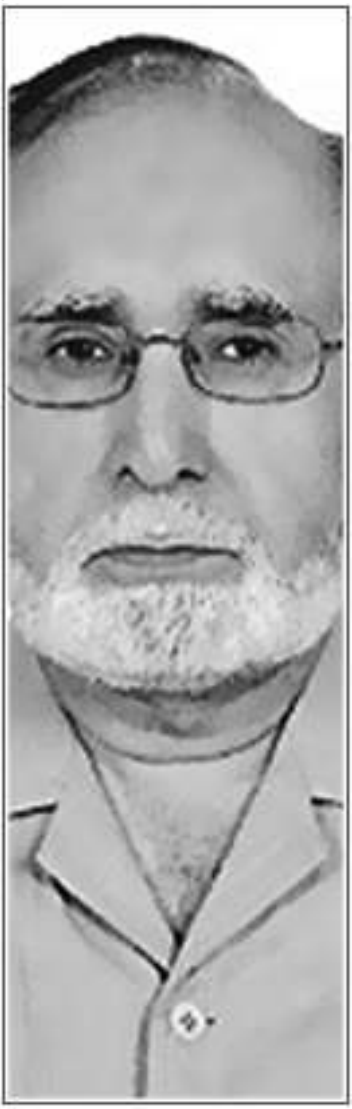

سید ضیا حسین

پاس رہتا نہیں تمہارے مَیں
جان جاؤں نہ عیب سارے مَیں

اِک زمانہ بنا لیا دشمن
اور کتنے سہوں خسارے مَیں

نیند تو ساتھ ہی گئی اُس کے
گنتا رہتا ہوں اب ستارے مَیں

آنکھ ملتا ہی رہ گیا اُس دم
دیکھ پایا نہیں نظارے مَیں

کھول کر خود نہ پڑھ سکا اِن کو
بانٹتا ہی رہا سپارے مَیں

بات کھُل کر کیا کرو مجھ سے
کچھ سمجھتا نہیں اِشارے مَیں

کوئی جلتا ہے گر، جلے بے شک
بھر چکا شعر میں شرارے مَیں

اک حقیقت ہے، چھوڑ کر خوش ہوں
ہر طرح کے ضیا سہارے مَیں

غزلیں

خدا کرے کہ ہمیشہ مرا رہے، آمین
جو میرا ہو وہ مرا اس طرح بنے، آمین

عجب نہیں کہ وہ تصویر سے نکل آئے
عجب دعا ہے کہ سینے سے آ لگے، آمین

تو کائنات کی ہر چیز مجھ کو مل جائے
مری دعا پہ اگر یار تو کہے، آمین

اگر وہ پلکیں اٹھائے صغیر کچھ نہ کہے
ہم اس کی بات پہ کہتے ہیں بن سنے، آمین

دعائیں کرتا ہوں جو میں وہ تم بھی کرتے رہو
خدا مٹا دے ہمارے یہ فاصلے، آمین

صغیر احمد صغیر

کبھی تو دیکھو گے ان کی لالی جناب عالی
ہماری آنکھیں جو ہیں سوالی جناب عالی

اب اور کیسا بنائیں خود کو جو بھائیں تم کو
کہ اب تو ہم نے انا بھی ڈھالی جناب عالی

عجب قرینہ، عجب مہارت ہے گفتگو میں
جو اتنا اچھے سے بات ٹالی جناب عالی

ہمارا بچپن کا یار تھا جو، وہ چاہتا ہے
ہم اس کو بولیں جناب عالی، جناب عالی

تمہاری ضد ہے تو نام بھی اب کے لیں تو کہنا
لو آج ہم نے قسم اٹھا لی جناب عالی

وہ جس کی خاطر مری محبت کو رد کیا تھا
اب اس کے دل میں جگہ بنا لی جناب عالی

جناب دنیا سے ڈر گئے نا؟ بدل گئے نا؟
ہمارے پیچھے بھی تھی یہ سالی جناب عالی

صغیر کیسے بتائیں اُس کو بدن ہمارا
ہے بائیں جانب سے اب بھی خالی جناب عالی

غزل

بام سے یوں اُتر رہے ہو تم
مجھ کو حیران کر رہے ہو تم

وحشتوں کے گمان میں رہ کر
اپنے سائے سے ڈر رہے ہو تم

پھر تلاشو گے روشنی ہر جا
گل چراغوں کو کر رہے ہو تم

پھر کسی دُور کی مسافت میں
لمحہ لمحہ بکھر رہے ہو تم

کوزہ گر بھی نظر میں رکھتا ہے
چاک پر پھر سنور رہے ہو تم

پھر وہیں سے گزر رہا ہوں میں
پھر وہیں سے گزر رہے ہو تم

طلعت شبیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مقدور سے کچھ بڑھ کے تو مجھ نہ تھا میں
یہ شکر کی منزل تھی ، سو خاموش رہا میں

غزلیں

تیرے سنگ تھا موج میلہ اک برس
اب گزاروں گا اکیلا ، اک برس

زندگانی دیکھ میرا حوصلہ
تجھ کو میں نے اور جھیلا اک برس

وقت کی پونجی بچاتا کس طرح
ہاتھ میں آیا نہ دھیلا اک برس

جانے کس جانب بہا کر لے گیا
تیری یادوں کا وہ ریلا ، اک برس

اُس نے بھی آنکھیں بدل لیں آج کل
میرے جذبوں سے جو کھیلا اک برس

گُر بتاتا ہے مجھے وہ الاماں
جو رہا تھا میرا چیلا اک برس

اس بجٹ سے بھی ہمیں ارشد ملا
پھر گرانی کا جھمیلا اک برس

ارشد محمود ارشد

زر پرستوں کے طرف دار نہیں بن سکتے
لاکھ چاہیں بھی تو ہم یار، نہیں بن سکتے

جایئے جا کے نگینوں کو پرکھنا سیکھیں
آپ یوسف کے خریدار نہیں بن سکتے

منزلیں دور سہی راستے پُر پیچ تو کیا
مسئلے راہ کی دیوار نہیں بن سکتے

یار سوچو کہ محبت میں کمایا کیا ہے
ہم جو دو سے بھی اگر چار نہیں بن سکتے

دستِ آذر کی مہارت کا اثر بولتا ہے
ورنہ کہسار سے شہکار نہیں بن سکتے

میری بیٹی میں تجھے علم کی دولت دوں گا
بھائی ورثے میں تو حق دار نہیں بن سکتے

یہ تو پھولوں سے محبت کا صلہ ہے ارشد
میرے اشعار کبھی خار نہیں بن سکتے

غزل

چار سو شہر میں سویرا ہے
ذہن میں سب کے پر اندھیرا ہے

خود پہ پختہ یقین ہے لیکن
آج کل وسوسوں نے گھیرا ہے

تجھ کو معلوم کیا نہیں جاناں
کون تیرا ہے کون میرا ہے

قافلے والے پارسا تو نہیں
ان کا سردار گر لٹیرا ہے

جس قدر ہے بگاڑ دنیا میں
آدھا تیرا ہے آدھا میرا ہے

ریت ساحل کی خشک رہتی ہے
ایسا موجوں نے ہاتھ پھیرا ہے

ہجر آنکھوں میں بس گیا میری
اب یہی روزگار میرا ہے

شہر سانپوں کا اس لیے ہے عطاؔ
والیٔ شہر خود سپیرا ہے

عطاالعزیز

غزل

ملے گا پیار آپ کا؟
بنوں شکار آپ کا؟

سبو تو میرے پاس ہے
مگر خمار آپ کا!

قبول ہے ہر ایک شے
بھلے ہو وار آپ کا

تو موسمی عذاب تھا؟
مجھے بخار آپ کا

مجھے ہی بس حرام ہے
یہ اختیار آپ کا

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ قربتوں کو بھی دُوری کا رنگ دیتا ہے
کُھلے کُھلے مری باہیں اکڑنے لگتی ہیں

غزل

جو بھاگ دوڑ کے ہم زندگی گزارتے ہیں
سفالِ جسم میں بس اک تھکن اتارتے ہیں

یہ مشکلات کا سیلِ بلا ہے چاروں طرف
ہمارے جیسے تو بس ہاتھ پاؤں مارتے ہیں

ترا خیال ہمیں چھو کے جب گزرتا ہے
وجود کو بڑی مشکل سے ہم سہارتے ہیں

جب آئنہ کوئی ہوتا نہیں میسر تو
تمھارا چہرہ خیالوں میں ہم ابھارتے ہیں

تجھے بتا نہیں سکتے یہی تو مشکل ہے
تری تمنا میں ہم خود کو کیسے مارتے ہیں

جو ریزہ ریزہ دلِ زار ہونے لگتا ہے
کسی کے دستِ خوش آثار کو پکارتے ہیں

اُنھی قبیلوں میں اپنا شمار ہے سید
کہ جو چراغ کی لو میں دھواں اتارتے ہیں

ثمینہ سید

غزل

بے عمل زمانے میں تیرگی بہانہ ہے
سب دیے بجھا دیجے آفتاب لانا ہے

تم نہیں ہو چارہ گر، زخم کیوں دکھائیں ہم
یاس کے پہاڑوں کو دردِ دل سنانا ہے

کس کی آرزو ہو تم، کس کی جستجو ہیں ہم
بات تو ذرا سی ہے، طعنہ زن زمانہ ہے

واعظا! خدا لگتی گر کوئی کہے تو سُن
تیری بات مبہم ہے، گفتگو فسانہ ہے

عشق اور وحشت میں فرق ہے فقط اتنا
وحشتوں کے تیروں کا عشق ہی نشانہ ہے

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

غزل

ہر خطا عشق میں سنگین ہوئی سب کی ہوئی
حُسن کے سامنے توہین ہوئی سب کی ہوئی

اُس کے آجانے سے محفل میں طبیعت امشب
میں نے دیکھا ہے کہ رنگین ہوئی سب کی ہوئی

بے وفا تیرا قبیلہ ہے مجھے بھی تجھ سے
کچھ پرے رہنے کی تلقین ہوئی سب کی ہوئی

ایک بھی خواب نہیں زندہ مری آنکھوں میں
آپ کی آنکھوں میں تدفین ہوئی سب کی ہوئی

رونے والوں سے مراسم تو نہیں تھے لیکن
شکل اس موڑ پہ غمگین ہوئی سب کی ہوئی

اُس نے اک بار سرِ جادہ پلٹ کر دیکھا
دیکھنے والوں کی تسکین ہوئی سب کی ہوئی

میں نے تو ایک پری چہرہ نہیں چھوڑا اسدؔ
میری جانب سے تو تحسین ہوئی سب کی ہوئی

اسد اعوان

غزل

میسر کہیں صاف پانی نہیں ہے
مرے شہر کی یہ کہانی نہیں ہے

بڑھاپے کے آثار ہیں ہر کسی پر
جوانوں پہ بھی وہ جوانی نہیں ہے

محبت میں جتنا خسارا ہُوا ہے
یہ سب آپ کی مہربانی نہیں ہے؟

حقیقت پہ مبنی ہیں کردار سارے
مرے پاس جھوٹی کہانی نہیں ہے

مری گفتگو میں رہا تو ہی شامل
ترا تذکرہ بے معانی نہیں ہے

ابھی اس کو دینی ہے کچھ اور مہلت
ابھی یہ حکومت گرانی نہیں ہے

بجھاتے کہاں پیاس اپنی پرندے
سمندر میں ذرّہ بھی پانی نہیں ہے

صدام ساگر

غزل

کہاں کسی کی محبت بھی ڈھونڈتی مجھ کو،
شناخت اپنی بھی جیسے نہیں رہی مجھ کو

کہیں پہنچنا تھا اس شام لازمی اس نے
گھڑی دکھاتا رہا تھا، گھڑی گھڑی مجھ کو

پھسلتا جاتا تھا وہ ہاتھ میرے شانوں سے
قریب کر کے سکھاتا تھا شاعری مجھ کو

کلائی اس نے دبائی ہوئی تھی ہاتھوں میں
ضروری پیار کی لگتی تھی، ہتھکڑی مجھ کو

نظر میں اس کی ذرا دیر دیکھتی رہی میں
ہر ایک سمت نظر آئی روشنی مجھ کو

یقیں کریں کہ وہ اک علم کا سمندر تھا
پسند اس کی زیادہ تھی عاجزی مجھ کو

پھر ایک روز کسی سمت چل دیا چپ چاپ
پھر ایک راز لگی تھی یہ زندگی مجھ کو

وہ گفتگو بھی بڑی باکمال تھی لیکن
زیادہ جلدی سمجھ آئی ان کہی مجھ کو

مجھے تو جھوٹ بھی سچ عنبرین لگتا تھا
کچھ اس طرح سے سناتا تھا راگنی مجھ کو

عنبرین خان

غزل

جانے کیا سرزد ہوئی آخر خطا، ناراض ہے
ایک مدت ہوگئی ہم سے خدا ناراض ہے

دل بھی شاید ہے کوئی اجڑا ہوا ایسا نگر
ظلمتیں جس کا مقدر ہیں، ضیا ناراض ہے

تم جو بچھڑے شہر کی رونق ہوئی خواب اجل
چار سو شام و سحر آب و ہوا ناراض ہے

وہ جو کرتے ہیں مسلماں ہو کے بھی کارِ یزید
ان درندوں سے مرے رب کی رضا ناراض ہے

ہاتھ کو میرے جھٹک کے چل دیا سایہ مرا
میں ابھی یہ پوچھنے والا ہی تھا، ناراض ہے؟

رک نہ جائیں بن ترے ساحل کہیں یہ دھڑکنیں
اے مرے خوابوں کے چارہ گر! بتا ناراض ہے

ارسلان ساحل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گل سے یا گلستاں سے ملتا ہے
رنگ کو نم کہاں سے ملتا ہے

غزلیں

ریشم و اطلس و کم خواب نہیں دیکھتے ہیں
ہم پہ الزام ہے ہم خواب نہیں دیکھتے ہیں

جب وہ آتا ہے سرِ شام لبِ بام کبھی
آسماں! ہم ترا مہتاب نہیں دیکھتے ہیں

آپ اسے کچھ بھی کہیں آپ کی مرضی ہے جناب
ٹھان لیتے ہیں تو اسباب نہیں دیکھتے ہیں

یہ الگ بات کہ ہنستے ہوئے ٹالا ہے اسے
دل پہ کیا گزری ہے احباب نہیں دیکھتے ہیں

بستیاں جن کی ہوں دریا کے کنارے فرہاؔد
گھر بناتے ہوئے سیلاب نہیں دیکھتے ہیں

فرہاد ترابی

کب تک جڑا رہوں گا میں اِس بیبسی کے ساتھ
جینا غمِ جہان میں وہ بھی خوشی کے ساتھ

نقصان اُس مقام پہ کافی مفید ہے
بجھتی ہو اپنی پیاس جہاں تشنگی کے ساتھ

ہے شکر آدمی کی ضرورت ہے آدمی
ورنہ کسی کا ساتھ بھی کب ہے کسی کے ساتھ

ہو ہی نہیں رہا تھا ترے زہر کا اثر
آخر ہماری موت ہوئی زندگی کے ساتھ

چپ رہ کے میرے کان کے پردے نہ پھاڑیے
صاحب نہ شور کیجیے یوں خامشی کے ساتھ

ہے اختیارِ عقل پہ غالب ضرورتیں
تعبیر ہو رہی ہے جو نیکی بدی کے ساتھ

دھک دھک تھی انتظار میں ٹک ٹِک کی ہمسفر
دھڑکن نے کافی وقت گزارا گھڑی کے ساتھ

راضی نہیں ہوں پیروئے مولا رضا بغیر
بس نسبتاً ہی لکھ دیا رضوی رضی کے ساتھ

رضی رضوی

غزل

نگاہِ شوق کے اب وہ سفر نہیں ہوتے
گلی ہے ایک، مگر باخبر نہیں ہوتے

لپٹ ہی جائیں جہاں قمقموں سے شاخیں سب
وہاں شجر پہ پرندوں کے گھر نہیں ہوتے

نہیں ہے گھر سے وہ نسبت کہ غم ملے ہم کو
خوشی کی بات ہے، ہم دربدر نہیں ہوتے

مرے ہی گاؤں میں ہے صرف قیدِ عورت، یا
ترے بھی دیس میں پریوں کے پر نہیں ہوتے

یہاں تو لوگ بدلتے ہیں صورتیں ایسی
چلیں گے ساتھ، مگر ہم سفر نہیں ہوتے

آفتاب محمود شمس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

فکر کے زہراب میں رس گھولیے تاثیر کا
درد کب محتاج ہوتا ہے کسی تفسیر کا

غزل

بکھرا رہا ہوں کب سے بکھر ہی نہیں رہا
اک شخص میرے دل سے اتر ہی نہیں رہا

مدت سے محوِ خواب ہیں پیہم سفر میں ہیں
بیدار ہو کے دیکھیے گھر ہی نہیں رہا

وحشت سرائے کس کے لیے کھول بیٹھیے؟
جب آئینے کو عکس کا ڈر ہی نہیں رہا

رکھوں گا کس نیام میں شمشیرِ خود شناس
پگڑی کا کیا کروں گا جو سر ہی نہیں رہا

آنکھوں پہ چھا گی ہے کدورت کی سرخ ریت
منظر کا حسن پیشِ نظر ہی نہیں رہا

بھر تو گیا ہے دید کا پیالہ وصال سے
میں کیا کروں کہ میرا جی بھر ہی نہیں رہا

کاشف اک عمر ہو گئی سجدہ ہے در بہ در
میری جبیں کے واسطے در ہی نہیں رہا

کاشف واصفی

غزل

نہ ہفت رنگ نہ گرد و غبار باقی ہے
کسی ذریعے سے اپنا شمار باقی ہے

یہ ٹوٹ پھوٹ محبت کی راکھ لفظوں میں
درونِ خانہ نظر میں فشار باقی ہے

جلایا مجھ کو چراغوں کے درمیان کہیں
کسی رقیب کا مجھ پر اُدھار باقی ہے

میں ہار ماننے والوں کو بھول جاتا ہوں
یہ دل کی جیت ہے جس کا خمار باقی ہے

یوں آنکھیں بند کیے سو بھی تو نہیں سکتا
جو کر رہا ہے مجھے پھر شکار باقی ہے

رہے گا مجھ پہ یونہی سلسلہ عنایت کا
کسی نگاہ کا اب تک حصار باقی ہے

علاقہ غیر تو دشمن کا ہو چکا بابر
جو گروی رکھا ہے اپنا دیار باقی ہے

امجد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزل

غزل کا مطلع سنوار لیتے ہیں آؤ بالوں سے بالیوں سے
سجیلے ماتھے کے سرخ ٹیکے سے اور ہونٹوں کی لالیوں سے

پُرانے کیمپس کے پیڑ ہاتھوں کا لمس پانے کے منتظر ہیں
وہ شخص چھو چھو کے سبز کرتا تھا پھول جھڑتے تھے ڈالیوں سے

یہ رسمِ تازہ گلاب پاشی بھی چیر دیتی ہے گُل کا سینہ
کہ پھول مٹی میں رول دیتے ہیں لوگ چُن چُن کے تھالیوں سے

مجاورانِ مزارِ اُلفت سے لوگ پوچھیں گے دفن کیا ہے؟
تو پیر و مرشد میں کیا بتاؤں گا کیا کہوں گا سوالیوں سے

ہم ایسے ویسوں کے حرفِ گریہ پہ داد دیتے ہیں آپ صاحب
ہماری وحشت کا بھاؤ بڑھتا ہے آپ لوگوں کی تالیوں سے

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دم سادھ کے دیکھوں تجھے، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں، ترے لہجے کی دمک بھی

غزل

کم ہی سہی پر وصل کا امکان تو ہے نا
جینے کے لئے چل کوئی سامان تو ہے نا

کیوں جی نہیں لگتا وہاں پرکھوں گا کسی دن
اب حسبِ طلب دشت بھی ویران تو ہے نا؟

دیتا ہے منافع بھی کہاں دل کو خوشی اب
نقصان نہ ہونے کا بھی نقصان تو ہے نا

مل جائے ترا جسم جو مسکن کو تو کیا بات
ورنہ یہ مرے جسم کا زندان تو ہے نا

مجنون سمجھتا رہے عزمی کو بھلے شہر
درویش تو ہے نا، اسے وجدان تو ہے نا

عزم الحسنین عزمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر جگے تو ہمیں خون میں تر دیکھیں گے
سنگ آنکھیں نہیں رکھتے ہیں کہ سر دیکھیں گے

غزل

بزمِ تنہائی جم چکی ہے میاں
خامشی بات کر رہی ہے میاں

تم مرے ساتھ ہو مگر پھر بھی
ایسا لگتا ہے کچھ کمی ہے میاں

میرے اجداد نے مجھے دی ہے
میرے ورثے میں شاعری ہے میاں

تم کہ جس پر غرور کرتے تھے
وہ جوانی کہاں گئی ہے میاں؟

عشق، غم، ہجر، خواب، تم اور میں
زندگی کھیل کھیلتی ہے میاں

شہر میں دل نہیں لگے گا مرا
گاؤں میں ایک سانولی ہے میاں

آئنے سے میں روز پوچھتا ہوں
آج تاریخ کونسی ہے میاں؟

علی آرش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خوشبو تھی جوانی میری

غزل

ترے قریب یہ مجھ کو مزید کر دے گی
یہ سرد مہری بھی چاہت شدید کر دے گی

کسی بھی طور ہوا کا یہ رخ بدلنا ہے
یہ بدحواس تو پتّے شہید کر دے گی

نہ میرے ساتھ پلٹنے کی گفتگو کرنا
یہ ایک بات مجھے پُرامید کر دے گی

وہ شعر فہم زمانہ شناس لڑکی ہے
غزل کہے گی تو لہجہ جدید کر دے گی

یہ پیش گوئی نہیں اِک کھلی حقیقت ہے
تجھے یہ خودسری خود سے بعید کر دے گی

وہ بارشوں سے بھرے پانیوں کے برتن کو
لبوں سے چھو کے طہورہ کشید کر دے گی

حِنائی ہاتھ کی پوروں میں ایک جادو ہے
وہ شاہ زادی ضرر کو مُفید کر دے گی!!

اَبھی بھی وقت ہے دانش سے کام لو ورنہ
یہ عاشقی ہے! یہ مٹی پلید کر دے گی!!!

دانش عزیز

غزل

گُلوں نے کہہ دیا کیا باغباں سے
بہار اب کے نہیں خائف خزاں سے

کشش باہم ثبوتِ اوّلیں ہے
تعلق ہے زمیں کا آسماں سے

پرندہ گھونسلے کی پھانس لے کر
بچھڑ جاتا ہے آخر آشیاں سے

یقیناً آپ تو ایسے نہیں تھے
مروّت اُٹھ گئی شاید جہاں سے

جُھلس کر راکھ تن من ہو چکا سب
دھواں اُٹھتا ہے کیوں خالی مکاں سے

میں سہہ لیتا اگر ہوتی عداوت
میں گھبرایا خُلوصِ دوستاں سے

غزل کی کِشت ہے ویران عارضؔ
کرو آباد پھر عزمِ جواں سے

سرفراز عارض

غزل

دل یونہی در بدر نہیں لگتا
واقفِ رہگذر نہیں لگتا

آپ کو دیکھنا ضروری ہے
آپ کو دیکھ کر نہیں لگتا

سوچ کر کیا! نکل پڑے گھر سے
راستہ مختصر نہیں لگتا

ہم نے اشکوں سے دوستی کر لی
اب سمندر سے ڈر نہیں لگتا

عکس کو خوب تر دکھاتا ہے
آئینہ معتبر نہیں لگتا

میرا ہونا تری کہانی میں
اکثر و بیشتر نہیں لگتا

رتجگوں کے عذاب اترے ہیں
اب تو بستر سے سر نہیں لگتا

جانے کس کام پر لگا عاصمؔ
دل کسی کام پر نہیں لگتا

عاصم اعجاز

غزل

زندگی کے سراب سے نکلے
حالتِ اضطراب سے نکلے

ہم نے اس کو بھلا دیا دل سے
پھول کچھ پھر کتاب سے نکلے

ہم تلاشِ وفا میں نکلے تھے
پھر نہ پاؤں رکاب سے نکلے

شیخ! پا لے خدا کی ہستی کو
گر گناہ و ثواب سے نکلے

وہ کسی ایک کا جو ہو جائے
شہر بھی اضطراب سے نکلے

اسے کھویا تو لاکھ اندیشے
دلِ خانہ خراب سے نکلے

شہزاد احمد شاذ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

غزل

تماشا لگا ہے دلالت کیے جا
سیاست ، حراست ، وکالت کیے جا

پتہ ہے تجھے کچھ مرے حال دل کا
تو ہجراں میں یارا طوالت کیے جا

یہ گھاؤ ترے ہیں جگر بھی ترا ہے
بڑے شوق سے تو کفالت کیے جا

یہ دستِ طلب جب ترے ہاتھ میں ہے
تو چاہے جہاں تک ذلالت کیے جا

ستا تو، جلا تو، جلا کر ستا تو
ستم گر! ستم میں جہالت کیے جا

تری زندگانی کا مقصد یہی ہے
محبت محبت محبت کیے جا

بتوں سے سروکار کیا تجھ کو طاہر
تو چہرے کی اس کے تلاوت کیے جا

طاہر منیر طاہر

غزلیں

بے ضمیروں سے محبت نہ کرو
تم خسارے کی تجارت نہ کرو

لوٹ لیتے ہیں جو رہبر بن کر
اُن درندوں سے رعایت نہ کرو

جو مقدر میں نہ لکھی رَبّ نے
ایسی شے کی کبھی حسرت نہ کرو

لوگ سڑکوں پہ نکل آئیں گے
یہ سرِ شام قیامت نہ کرو

جو فنا ہونی ہے آخر اِک دن
ایسی دنیا سے محبت نہ کرو

خشک پتے تو بکھر جاتے ہیں
تیز جھونکوں کی شکایت نہ کرو

ظلم کو دو نہ بڑھاوا شافی
کبھی ظالم کی حمایت نہ کرو

عقیل شافی

موت کے سامان ہو جائیں گے کیا؟
شہر بھی ویران ہو جائیں گے کیا؟

جن کی خاطر سختیاں برداشت کیں
ہم پہ وہ قربان ہو جائیں گے کیا؟

لہلہائیں گی کیا پھر سے کھیتیاں؟
شہر نخلستان ہو جائیں گے کیا؟

منزلیں نزدیک ہوتی جائیں گی؟
راستے آسان ہو جائیں گے کیا؟

بانٹنے خوشیاں وہ شافی آئے گا
سب کے سب حیران ہو جائیں گے کیا؟

غزل

غریبی میں بھی وہ لاکھوں خزانے ساتھ رکھتا ہے
اندھیروں میں بھی اس کے ہونے سے ہر سو اجالا ہے

یہ بستی بھی پرانی ہے یہاں غم کا بسیرا ہے
دکھوں کا ایک دریا بھی ہمارے ساتھ بہتا ہے

خیال اس کا بھی میرے حوصلے کا ایک ساماں ہے
مجھے جب درد ہوتا ہے وہ میرے ساتھ رہتا ہے

تو پھر گیتوں کے چشمے پھوٹتے ہیں میرے لہجے سے
پرندہ آ کے میرے سامنے جب گنگناتا ہے

سناتا ہے کہانی گور کن بے نام عاشق کی
لحد میں چیخ کر ظالم کسی کا نام لیتا ہے

اسی کا نام شاید زندگانی ہے زمانے میں
تری آنکھوں کی مستی سے جو اک مسکان لیتا ہے

دعاؤں کی زباں پر بھی اسی کا نام رہتا ہے
شہاب اب تو مری آنکھوں سے اس کا عکس بہتا ہے

شہاب اللہ شہاب

غزل

محمد علی ایاز

ہر ایک خوف سے خود کو چھڑانے والا ہوں
میں رازِ ہستی سے پردہ اٹھانے والا ہوں

غمِ حیات! یہ دل سے نکال دے تو بھی
میں تیرے زخم کسی کو دکھانے والا ہوں

زمین زاد ہوں، سو اپنی خاک ہستی کو
میں آسمان کی جانب اڑانے والا ہوں

اسے تلاش تھی ایسے ہی اک ٹھکانے کی
سو آج دل کو ٹھکانے لگانے والا ہوں

خدائے میر! عطا ہو مجھے کوئی مصرعہ
میں شاعری کو حوالہ بنانے والا ہوں

ترے سوا بھی کسی د کھوں ندیم ، مگر
”ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو“

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

کوکی گل

آ گئی آب و تاب کانٹوں میں
گل پڑے بے حجاب کانٹوں میں

پتی پتی بکھر نہ جائے کہیں
پھنس گیا ہے گلاب کانٹوں میں

مفلسی نے اڑائے رنگ و بو
جیسے گزرا شباب کانٹوں میں

رات بھر پھول اوس سے بھیگے
صبح ٹپکی شراب کانٹوں میں

اشک پلکوں سے یوں گرے کوکی!
اٹھ رہے تھے حباب کانٹوں میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آگ تاپی عجب ، عمر بھر ، بے طلب
جل بجھے ، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

غزلیں

ختم ہونے کو جو ہوتا ہے سفر بولتے ہیں
کچھ مسافر ترے بارے میں اگر بولتے ہیں

یہ الگ بات ہے تم آہیں نہیں سُن سکتے
جب بھی چلتی ہے کہیں آری، شجر بولتے ہیں

دوسری بار تردد نہیں کرنا پڑتا
پہلی دستک پہ ہی ترسے ہوئے در بولتے ہیں

اتنا میٹھا ترا لہجہ ہے خدا خیر کرے
اچھے اچھے بھی ترے زیرِ اثر بولتے ہیں

دن کو ہوتا ہے یہاں عالمِ ہُو کا منظر
رات ڈھلتے ہی یہ وحشت زدہ گھر بولتے ہیں

اسد رضا سحر

کہانی کچھ ایسے بنائی گئی ہے
کہ اس میں حقیقت چھپائی گئی ہے

فسانے کا اس پہ گماں ہو رہا ہے
ہمیں داستاں جو سُنائی گئی ہے

حقیقت کا اس سے تعلق نہیں ہے
جو تصویر سب کو دکھائی گئی ہے

تمہارے لیے کھیل ہے روٹھ جانا
مری عُمر بھر کی کمائی گئی ہے

ہے اوقات دل کیا بجز قطرۂ خوں
مگر اس میں دُنیا بسائی گئی ہے

مُجھے ہے محبت زمانے کی دولت
تُمہارے لئے بس یہ آئی گئی ہے

راجہ عبدالقیوم

غزلیں

ہم نے ہر ظلم سہا پھر بھی شکایت نہیں کی
اُس نے بھی ترک یہ اپنی کبھی عادت نہیں کی

ہم نے ظالم سے کبھی رحم کی مانگی نہیں بھیک
اور اُس نے بھی کبھی ہم سے رعایت نہیں کی

سر کٹا، خون بہا، پشت پہ کوڑے بھی لگے
ہم نے آمر کی کسی طور حمایت نہیں کی

ہم تو باغی نہیں سلطان تجھے مانتے ہیں
حق کی آواز اٹھائی ہے، بغاوت نہیں کی

وسیم جبران

سچ میں کیا شرم کہ تم کھل کے بتا سکتی ہو
اپنی توہین پہ آواز اٹھا سکتی ہو
زندگی ہے یہ تمہاری تو تمہارا حق ہے
اپنی مرضی سے کسی سمت بھی جا سکتی ہو
یہ ضروری تو نہیں تم ہی نشانے پہ رہو
تیر اپنا بھی کبھی کوئی چلا سکتی ہو
تم بھی کمزور نہیں ہو ذرا ہمت تو کرو
تم اگر چاہو تو دنیا کو ہرا سکتی ہو
جو ہیں ہمدرد تمہارے انھیں پہچانو تم
جو ستاتے ہیں انھیں تم بھی ستا سکتی ہو

ہم نے دیکھا ہے جو آنکھوں سے وہی لکھتے ہیں
سچ ہی بولا ہے کبھی زرد صحافت نہیں کی

ہم تو قربان بھی ہونے سے نہیں گھبراتے
ہم نے لاشیں ہی اٹھائی ہیں، سیاست نہیں کی

میں تو نزدیک تمہارے ہوں کوئی دور نہیں
تم کسی وقت بھی چاہو تو بلا سکتی ہو
تم مٹا سکتی ہو ہر یاد پرانی دل سے
اور اگر بھولنا چاہو تو بھلا سکتی ہو
میں محبت کا ہوں اک گیت، یہ سن لو جاناں!
تم مجھے چاہتی ہو دل سے تو گا سکتی ہو

غزل

تیری آنکھوں کے جو اشارے ہیں
دید کو کافی یہ نظارے ہیں

تو میرے آنسوؤں پہ طنز نہ کر
چھو کے دیکھ آتشیں یہ دھارے ہیں

چپ جو بیٹھے ہیں تیری محفل میں
جانے کیسے دکھوں کے مارے ہیں

وہی بدلیں گے اب نظامِ حیات
لوگ جو مفلسی کے مارے ہیں

اپنا حسن نظر نہ کھو محسن
دیکھ تو ذرّے بھی ستارے ہیں

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شیشے کے انسان
پتھر کا سنسار

غزلیں

اَمن سانچے میں اُس نے ڈھالا ہے
جس نے ہر اک بلا کو ٹالا ہے

دل سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا
اُس نے کیا خوب دل سنبھالا ہے

چین کس طرح مل سکے گا تمہیں
تم نے خود خواہشوں کو پالا ہے

کیسی جمہوریت ہے یہ آخر
دیکھو ہر اک زباں پہ تالا ہے

سچ تو اب سر نِگوں ہُوا نقوی
جھوٹ کا اتنا بول بالا ہے

معظّمہ نقوی

زندگی ہے بھی کیا اِک پہیلی ہے یہ
اچھی ہے یا بُری بس سہیلی ہے یہ

زندگی لوگ کہتے ہیں جس کو سبھی
یہ گزاری نہیں ہم نے جھیلی ہے یہ

پیار دنیا کو ہر بار ہم نے دیا
کیا کریں ہم سے ہر بار کھیلی ہے یہ

ہم نے دشمن کو بھی دی ہیں خوشیاں مگر
سُونی اب تک ہماری ہتھیلی ہے یہ

ساتھ میرے اُداسی رہے رات دن
میری محسن ہے یہ میری بیلی ہے یہ

سب کی غم خوار یہ جانتے ہیں ثبات
کیوں بھری دنیا میں پھر اکیلی ہے یہ

کشور ثبات

غزلیں

میں وہ کتبہ ہوں جو نہ ہو تو قبر کھو جائے گی
ہم اگر نہ ہوں تو تُو دربدر ہو جائے گی

ایک تیرے ساتھ سے ہے دل کو ڈھارس اس قدر
جیسی بھی مشکل پڑے لیکن وہ سر ہو جائے گی

ہو اگر تنہا سفر میں تم تو گھبرانا نہیں
دشت کی وحشت تمہاری ہمسفر ہو جائے گی

زین علی رضوی

وہ ایک عمر کی راتوں کی بے داری سے نکلے گا
گلابِ عشق ہے کانٹوں بھری جھاڑی سے نکلے گا

مزہ مخلص مزاجی کا تجھے معلوم ہوگا تب
کہ جب تو کوفیوں کی صفتِ عیاری سے نکلے گا

ہو جس وقت جیب خالی جب بھی تم صدقہ ادا کرنا
یہ ہی وہ راز ہے تو جس سے ناداری سے نکلے گا

ایک صحرا میں لیئے بیٹھا ہے کشتی اور تو
سوچتا ہے تجھ سے طے یہ راہ گزر ہو جائے گی

بے سر و سامان جاتے ہیں سوئے دشتِ جنون
زین ملنے سے محبت بے قدر ہو جائے گی

جو میرا دشمنِ جانی مجھے جینے نہیں دیتا
وہ میرے اپنے گھر کی چار دیواری سے نکلے گا

غزل

آخری نقش بھی ہونے کا مٹا دیتے ہیں
میری تصویر وہ پلکوں سے گرا دیتے ہیں

اپنے دل میں کہیں نفرت کو جگہ دیتے ہوئے
جانے کیوں لوگ محبت کو بھلا دیتے ہیں

باتوں باتوں میں تری یاد دلانے والے
کتنے سوئے ہوئے خوابوں کو جگا دیتے ہیں

رنج کی اوس میں بھیگے ہوئے معصوم حروف
میرے ہر شعر کو شہکار بنا دیتے ہیں

اب امیدوں کے چراغوں کا بھرم ٹوٹ چلا
غیر چھوڑیں تو مرے یار بجھا دیتے ہیں

کم سے کم، شور مچاتے ہوئے طائر نعمان
گھر میں تنہائی کا احساس مٹا دیتے ہیں

نعمان منظور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تری آہٹ پہ سڑکوں پر نکل آئے تو کیا
ہم کو تو رُسوا سرِ بازار ہونا تھا ہوے

بھیتر کی سادھنا

شاعرِ امروز

تہذیب حافی

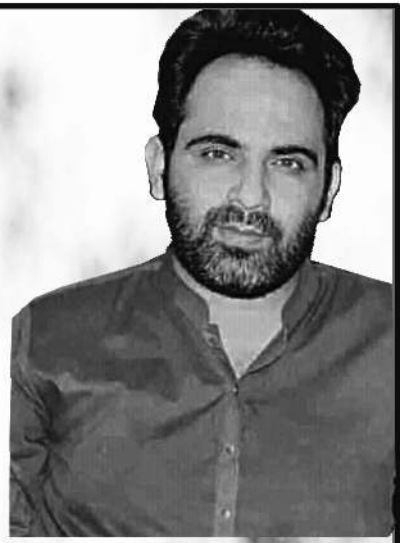

شاہد ماکلی

تہذیب حافی کی شاعری بھیتر میں چلنے والی پُروائی کی سمفنی ہے۔ من مستی کی سادھنا ارادھنا ہے۔ پھول کی طرح اپنی خوشبو میں مست مگن رہنے والے لیکھک کی لکھت ہے۔ من کی منجدھار اور چیتے کی چودھار میں کھوئے ہوئے کوی کار کی کویتا ہے۔ ذات زمان کے غار اُسرار میں سیر کرنے والے کھوجی کا مایا سرمایہ ہے۔ دھیان گیان کی جھلملتا میں چمکنے والے نروانی کا رُوپ سروپ ہے۔ جوگ جنتر کھ منتر جاپنے الاپنے والے گیانی کا گیان ہے۔ اَن دیکھے دیسوں کے درشن کو نکلے ہوئے جاتری کی جاترا ہے۔ دوش پہ دوشالا ڈالے، نئی نویلی راہوں گزرگاہوں کے رمتا کا جوگ سنجوگ ہے۔ شاعری کے مہکیلے سندر بن کے تپسّیا کار کی تپیا ہے۔ شعران کا پیت پریم ہے۔ شعران کا زہد جہد ہے۔ شعران کا نور نار ہے۔ وہ اپنے جاب الاپ میں جتنے سادہ، سلیس اور سجل ہیں، اپنے آپ میں اتنے ہی گہرے، گھنے اور گنجان ہیں۔

انھوں نے 5 دسمبر 1989ء کو تونسہ کے گاؤں ٹبی قیصرانی میں جنم پایا۔ 2006ء سے لکھت میں ہیں۔ غزل کے علاوہ کویتا کاری کی سجاؤنار چاؤنار رکھتے ہیں۔

پُختہ بُنت کے کچھ شعر آپ کی پڑھت کے لیے:

آپ نے مجھ کو ڈبویا ہے کسی اور جگہ
اتنی گہرائی کہاں ہوتی ہے دریاؤں میں

گلی سے کوئی بھی گزرے تو چونک اٹھتا ہوں
نئے مکان میں کھڑکی نہیں بناؤں گا

اسی لیے تو مرا گاؤں دوڑ میں ہارا
جو بھاگ سکتے تھے بیساکھیاں بنا رہے تھے

گھر بار بُھلا دیتی ہے دریا کی محبت
کشتی میں گزار آیا ہوں جیون، اسے کہنا

رہ رہ کے دہک اٹھتی ہے یہ آتشِ وحشت
دیوانے ہیں صحراؤں کا ایندھن اسے کہنا

کبھی کبھی وہ خدا بن کے ساتھ چلتا ہے
کبھی کبھی تو وہ انسان بھی نہیں لگتا

میں اُس کے پاس کسی کام سے نہیں آتا
اسے یہ کام کوئی کام ہی نہیں لگتا

کسی بااعتماد موسم میں
تیرے مشکوک لوٹ آئیں گے

اس قدر یاد ہو دعاؤں میں
بھول جاتا ہوں مانگنا کیا ہے

تو اِدھر دیکھ ! مجھ سے باتیں کر
دوست ! چشمے تو پھوٹتے رہیں گے

تیرے آنے پہ خوش تو میں بھی تھا
پھول پھینکے نہیں گئے مجھ سے

پانیوں کو بھی خواب آنے لگے
اشک دریا میں ضم کیا گیا ہے

نظر ملائی تو آنکھوں سے اٹھ رہا ہے دھواں
اب اس سے ہاتھ ملانے کی آرزو ہے مجھے

میں اس کے ساتھ جس طرح گزارتا ہوں زندگی
اسے تو چاہیے کہ میرا شکریہ ادا کرے

تیرا چپ رہنا مرے ذہن میں کیا بیٹھ گیا
اتنی آوازیں تجھے دیں کہ گلا بیٹھ گیا

میں اسے دیکھتا رہتا ہوں کہ میں جانتا ہوں
دیکھتے رہنے سے تصویر نئی رہتی ہے

میں نے بھی زندگی اور شب ہجر کاٹی ہے سب کی طرح
ویسے بہتر تو یہ تھا کہ میں کم سے کم کچھ نیا کاٹتا

تم چاہتے ہو تم سے بچھڑ کے بھی خوش رہوں
یعنی ہوا بھی چلتی رہے اور دیا جلے

میں اس کے ساتھ ساتھ رہا اور خوش رہا
پھر اُس نے مجھ سے پوچھ لیا، آپ کون ہیں

تم مری آنکھ کے بارے میں بہت پوچھتے ہو
یہ وہ کھڑکی ہے جو دریا کی طرف کھلتی ہے

تجھے پتہ تو چلے بے زبان چیز کا دکھ
میں اب چراغ کی لَو ہی نہیں بناؤں گا

میں تو آنکھیں دیکھ کے ہی بتلا دوں گا
تم میں سے کس کس نے دریا دیکھا ہے

ہزاروں لوگ اس کو چاہتے ہوں گے، ہمیں کیا
کہ ہم اُس گیت میں سے اپنا حصہ گا رہے ہیں

سارا دن ریت کے گھر بناتے ہوئے اور گراتے ہوئے بیت جاتا
شام ہوتے ہی ہم دور بیٹوں میں اپنی چھتوں سے خدا دیکھتے تھے

صحرا سے ہو کے باغ میں آیا ہوں سیر کو
ہاتھوں میں پھول ہیں، مرے پاؤں میں ریت ہے

بس کانوں پر ہاتھ رکھے تھے تھوڑی دیر
اور پھر اُس آواز نے پیچھا چھوڑ دیا

میں آ رہا تھا راستے میں پھول تھے
میں جا رہا ہوں کوئی روکتا نہیں

چاہتا کب ہے مجھے، مجھ پہ ترس کھاتا ہے
جیسے اندھے کو سڑک پار کرا دی جائے

تم نے کیسے اس کے جسم کی خوشبو سے انکار کیا
اس پر پانی پھینک کے دیکھو، کچی مٹی جیسا ہے

سو اس تعلق میں جو غلط فہمیاں تھیں اب دور ہو رہی ہیں
رُکی ہوئی گاڑیوں کے چلنے کا وقت ہے، دُھند چھٹ رہی ہے

سفر کے دوران کیسی خوشبو ہے پانیوں میں
یہ کشتی صندل کی لکڑیوں سے بنی ہوئی ہے

مجھ ایسے پیڑوں کے سوکھنے اور ہرے ہونے سے کیا کسی کو
یہ بیل شاید کسی مصیبت میں ہے جو مجھ سے لپٹ رہی ہے

☆☆☆☆☆

استعارہ ساز شاعر

شاعرِ امروز
سعید شارق

شاہد ماکلی

سعید شارق کی غزل کا سب سے مضبوط اور غالب شعری وسیلہ استعارہ سازی ہے۔ استعارے کا برتاؤ ان کے ہاں اسمیّت کی سطح پر بھی پایا جاتا ہے اور فعلیّت کی سطح پر بھی۔ مگر اسمیّت کی سطح پر زیادہ ہے۔ پچھلے دس سالوں (2010ء سے 2020ء) کے دوران جتنے اہم غزل گو سامنے آئے ہیں، سعید شارق اُن میں واحد شاعر ہیں جو استعارے کی قوّت اور تخلیقی امکانات کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لائے ہیں۔ استعارہ سازی نے ان کی شاعری میں فطری اور فوق الفطری عناصر کو یکجا کر دیا ہے۔ یوں ان کی غزل میں ایک پُراسرار فضا اور جادوئی حقیقت نگاری کی دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔

معاصر غزل گو شعراء میں بہت کم لوگوں نے استعارے کی اہمیت کو سمجھا اور اسے برتا ہے۔ بیدل فارسی غزل کے اور غالب اردو غزل کے سب سے بڑے استعارہ ساز شاعر ہیں۔ دونوں کی شعری عظمت میں جہاں دیگر عناصر کارفرما ہیں، وہاں ان کی استعارہ سازی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ استعارہ سب سے اہم فریضہ یہ انجام دیتا ہے کہ معنی کو گردش میں لاتا ہے، اسے جامد ہونے سے بچاتا ہے اور زمان و مکان کی باؤنڈری کو توڑ کر معنی کو آگے منتقل کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے سعید شارق لائقِ تحسین ہیں کہ وہ نہ صرف نئے استعارے کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں بلکہ غزل میں اس کا جمالیاتی استعمال بھی کثرت سے کرتے ہیں۔

سعید شارق 3 جون 1993ء کو اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔ "سایہ" کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ 2017ء میں شائع ہوا، جسے سنجیدہ ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی ملی ہے۔ وہ بی ایس انجینئرنگ ٹیکنالوجی

(مکینیکل) میں ڈگری ہولڈر ہیں۔ ان دنوں نمل یونیورسٹی میں ایم فل (اردو) کے طالب علم ہیں۔
ذیل میں ان کے منتخب اشعار کا گلدستہ قارئین کی نذر:

کتنی مشکل سے ملی مجھ کو کلیدِ در چشم
اور اب دیکھا تو کچھ بھی نہیں الماری میں

دیکھ! آ پہنچا ہوں کس طرح سرِ کوہِ ملال
میں وہی ہوں، جسے اُونچائی سے ڈر لگتا تھا

بیتے دنوں کی دھوپ سمٹنے کی دیر تھی
سایوں نے لے لیا مجھے اپنے حصار میں

ایک ہی عمر ہے دونوں کی مگر دیکھنے میں
میری تنہائی ذرا مجھ سے بڑی لگتی ہے

بھپتیاں کستی ہے مجھ پر، کبھی خود پر شارق
ناؤ کا ذکر بھی چھیڑوں تو ندی ہنستی ہے

گزر نہ جائے سماعت کے سرد خانوں سے
یہ بازگشت جو چپکی ہوئی ہے کانوں سے

نہ جانے کیسا مکاں بن رہا ہے سینے میں
سڑک تو کیا، اسے کوئی گلی نہیں لگتی

یہ کوزے تو یونہی خالی پڑے ہیں
تو اتنی دیر سے کیا بھر رہا ہوں؟

ہم دونوں اپنے اپنے معانی بدل چکے
اک عمدہ شعر آپ ہی دولخت ہو گیا

روشن پہاڑیوں سے اُدھر، کوہِ تار میں
کب تک پڑا رہوں گا اداسی کے غار میں

کیا جانے کب نکل پڑے کن جنگلوں کی سمت
یہ پیڑ اب نہیں ہے مرے اختیار میں

وہ بھی دن تھے یہاں خواہشوں کا کئی منزلہ گھر بنا تھا
اور اب رنج کی کالی مٹی سے دل کا گڑھا بھر رہا ہوں

خواب کے غار میں جانے کتنے برس کاٹ آیا ہوں شارق
اور سوچوں تو لگتا ہے جیسے فقط ثانیہ بھر رہا ہوں

ٹوٹا پڑا تھا نیند کا دھاگا مری طرح
سو میں نے اس میں خواب کے موتی پرو دیئے

اپنا بھی غم منایا ترے غم کے ساتھ ساتھ
اک طاق میں جلانا پڑے مجھ کو دو دیئے

لگے رہیں گے کہاں تک سکوت کے خیمے
وہ شور ہے کہ طناب صدا اکھڑتی ہے

کھڑکیاں ٹوٹ گریں، وقت کا دَھل جائے
ضرب ایسی ہو کہ دیوار کا سر کھل جائے

کبھی سناٹے کی تصویر، کبھی چاپ کا عکس
کتنے منظر نظر آئے ہمہ تن گوشی میں

نہ ہاتھ رکھنے سے کاغذ خموش ہو پایا
نہ شور گھٹ سکا لفظوں کے ہونٹ سینے سے

ابھی دھندلا نہیں آواز کا عکس
مگر تصویر ہکلانے لگی ہے

دہانے پر ہیں کئی ستاروں کے زرد جالے
سفید جنگل کی اوٹ میں ایک غارِ شب ہے

شاخوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو
کس شام کا سایہ ہے شجر پر

سفالِ چشم یونہی بھربھری نہیں ہوتی
ضرور کوئی شجر جڑ پکڑنے والا ہے

عین ممکن ہے وہیں میرے شب و روز بھی ہوں
شہرِ ناوقت کے ملبے سے گھڑی نکلی ہے

اس لیے بھی تجھے ملتا ہوں میں اک اک کر کے
روند ڈالے نہ تجھے بھی مری بہتات کہیں

لے اُڑی، بادِ سخن، دل سے مرے رنج کا بیج
نخلِ افسردگی اب جانے کدھر لگ جائے

تو کبھی ٹیک لگا مجھ سے، کبھی باتیں کر
کیا خبر، کب مرے اندر کوئی در لگ جائے

بھاگتے بھاگتے تکتا ہوں وہیں، مُڑ مُڑ کر
میرے پیچھے نہ مرا رختِ سفر لگ جائے

لہو میں تیرتا رہتا ہے اک اندھیرا دن
سو کوئی رات بھی مجھ کو نئی نہیں لگتی

یقیں تھا، باغِ فردا تو مہکتا ہو گا لیکن
میں پہنچا تو وہاں کچھ بھی تر و تازہ نہیں تھا

اکیلے سالگرہ مَیں نے کب منائی تھی!
اُداسی بتیاں، تنہائی کیک لائی تھی

پھر ایک روز وہی دُھوپ میرے کام آئی
جو تیرے سائے سے چُھپ کر کبھی بچائی تھی

ملال مُٹھی میں رہتا تھا ہاتھ جھاڑ کے بھی
کبھی غضب کی مرے ہاتھ میں صفائی تھی

غم اپنی اپنی درانتی سنبھالے آ پہنچے
پھر آج مجھ میں کسی فصل کی کٹائی تھی

کھینچتے کھینچتے تھک جاتے ہیں بازو شارق
چادرِ رنج سرکتی ہی نہیں شانے سے

جانے کس پھول کو مسلا تھا کہ ہر سُو مجھ میں
جھاڑیاں اگتی رہیں ردِعمل کی صورت

بخش دیا سرِ فرشِ فراق تو یہ کُھلا
مرے وجود سے لبریز تھا ایاغ اُس کا

منہ چڑاتی ہے سمندر کی خموشی، شارق
جانے کن لہروں میں بٹتی ہے توانائی مری

بہت دن اوڑھے رکھا روشنی کے چیتھڑوں کو
اور اب اک شب مجھے اپنا بدن پہنا رہی ہے

کب کا دیوار ہو چکا ہوں مَیں
اور وہ کھٹکھٹا رہی ہے مجھے

کب تھک کے گروں اور مرے اوپر سے گزر جائے
اک راہ گزر کب سے پڑی ہے مرے پیچھے

فصیلِ خواب سے یوں سر پٹکتے پھرنا کیا
ذرا ٹھہر! میں کوئی راستہ بناتا ہوں

☆☆☆☆☆

''سفیرِ نقد و نظر'' ___ ڈاکٹر فرحت عباس کا خاکہ

جس طرح ڈاکٹر فرحت عباس کی اور میری دوستی مثالی ہے، اِسی طرح اُن کی ہر کتاب پر میرا اظہارِ خیال بھی لازم و ملزوم ہو چکا ہے، اس مرتبہ سوچا کہ ذرا ذائقہ بدلنے کے لیے ان کا خاکہ لکھا جائے۔ جب یہ ذکر ان سے کیا تو انہیں بہت پسند آیا تاہم وہاں موجود ایک خاتون نے جب یہ سوال کیا کہ خاکہ کیا ہوتا ہے، تو میرے کچھ کہنے سے قبل ڈاکٹر صاحب نے اس کا جو جواب دیا، اُس کی روشنی میں اگر یہ خاکہ لکھا جاتا تو یہ خاکہ پٹاخہ بن جاتا، چنانچہ میں ان کا جواب بھول کر اپنے انداز میں لکھ رہا ہوں۔

اپنی بات ''سفیرِ نقد و نظر'' کے صرف پہلے لفظ یعنی سفیر سے شروع کرتا ہوں۔ ہنری کسنجر نے کہا تھا کہ سفیر جب 'نہ' کہتا ہے تو اُس کا مطلب 'ہاں' ہوتا ہے اور 'ہاں' کہے تو اُس کا مطلب انکار ہوتا ہے۔ وہ سیاستدان تھا، ڈاکٹر فرحت عباس قلمکار ہیں اس لیے ان کے اندازِ سفارت کاری ہنری کسنجر سے یکسر جدا ہیں اور اُن کا مطلب وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں یا جو کچھ وہ کتاب میں لکھتے ہیں۔ سچائی سیاستدان کے لیے جتنی نقصان دہ ہے قلمکار کے لیے اتنی ہی فائدہ مند ہے۔ اور ڈاکٹر فرحت عباس کی یہی سچائی ان کے قلم کی نوک پر ہے۔

مشہور ہے کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ ڈاکٹر صاحب کے کیس میں نہ تو وقت کم ہے اور نہ مقابلہ سخت ہے، بھلا کون ان کی طرح یکے بعد دیگرے تنقیدی مضامین پر مشتمل چھ کتابیں چند مہینوں میں لکھ اور چھپوا

نسیمِ سحر

سکتا ہے جبکہ آخری کتاب میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ عنقریب اُن کی تین مزید کتابیں بھی آنے والی ہیں۔ میرا اُن کا سلسلہ کچھ خرگوش اور کچھوے کی روایتی دوڑ جیسا ہے جس میں کچھوا صرف اس لیے جیت جاتا تھا کہ خرگوش لمبی دوڑ لگا کر ستانے بیٹھ جاتا تھا، مگر ڈاکٹر فرحت عباس کی کیمسٹری میں شاید آرام کا لفظ شامل ہی نہیں اس لیے لمبی دوڑ بھی وہی لگاتے ہیں اور جیتتے بھی وہی ہیں، میں تو ایک آدھ مضمون لکھ کر ہانپنے لگتا ہوں، اور وہ یوں لکھتے ہیں کہ بس' چل مرے خامے بسم اللہ' کا سا حال ہوتا ہے۔ ایک مجھ ناتواں پر ہی آخری خبریں آنے تک ان کے مضامین کی تعداد چودہ ہو چکی ہے جبکہ میں اس محبت کا جواب کوئی ایک چوتھائی یا ایک تہائی ہی دے سکا ہوں۔

اب ذرا کتاب کے عنوان میں 'نقد و نظر' کے الفاظ پر بات ہو جائے۔ لفظ 'نقد' کا تعلق مالیات سے بھی ہے، اور تنقید سے بھی۔ مالیاتی حوالے سے ڈاکٹر صاحب نقد وصول کرنے کے کم اور لٹانے کے قائل زیادہ ہیں جس کا فائدہ ان کے کچھ خوشامدی دوست بڑی سہولت سے اٹھاتے ہیں۔ نقد و نظر کا دوسرا لفظ ہے' نظر'، تو انہوں نے نظر کا حاتم طائیانہ استعمال کتب بینی میں بھی اور چہروں کا مطالعہ کرنے میں بھی خوب کیا ہے، حتیٰ کہ انہیں اگر "اہلِ نظر" کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا، اور یقیناً یہاں بہت سی موجود اور غیر موجود خواتین میری تائید کریں گی۔ مرد تائید کریں یا تردید، کوئی فرق نہیں پڑتا!

کسی کتاب پر مضمون لکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بس پندرہ بیس منٹ درکار ہوتے ہیں، البتہ کتاب پڑھنے کا وقت الگ ہے۔ ان کی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری دیکھ کر مجھے جدہ، سعودی عرب کا ایک شاعر یاد آ گیا جو مشاعرے میں ہر غزل یا نظم یہ کہہ کر سناتا تھا کہ آتے ہوئے جب ایک سگنل پر گاڑی روکی تو یہ شعر ہو گیا، یوں راستے میں انہیں جتنے سگنلز پر رکنا پڑتا، غزل اتنی ہی طویل ہوتی۔ اسی لیے جب مشاعرہ گاہ ان کے گھر کے بہت نزدیک ہوتی تو ان کے پاس کوئی غزل نہیں ہوتی تھی، بلکہ جب کبھی دور کی مسافت پر بھی راستے کے تمام سگنلز سبز ملتے تھے، اور ان کی کار رکتی نہیں تھی، تو وہ مشاعرے میں تو آتے مگر کلام سنانے سے معذرت کر لیتے تھے۔ خیر، ڈاکٹر فرحت کا معاملہ یکسر الگ ہے، سگنل سبز ہو، سرخ ہو یا زرد، گاڑی تیز چلے یا آہستہ اُن کی برق رفتاری کا سپیڈو میٹر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے سینکڑوں مضامین ایک مرتبہ دیکھے تو حیرت

زدہ رہ گیا اور رئیس امروہوی (مرحوم) کا مصرع یاد آ گیا کہ لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں، بلا مبالغہ انہوں نے نظم و نثر میں اس قدر لکھا کہ یار لوگوں نے افسانے تراش لیے کہ وہ شاعری زید سے، مضامین عمر سے اور کالم بکر سے لکھواتے ہیں۔ کبھی کبھی اس زید، عمر اور بکر میں میرا نام بھی آتا رہا، اور اگر میں نے ان کے ہاتھ سے لکھی تحریریں دیکھی نہ ہوتیں تو شاید اس بات پر اعتبار کر لیتا۔ اسی طرح ان کی شاعری بھی میرے سامنے کی بات ہے، جب وہ شاعری کے موڈ میں ہوتے ہیں اور مصرع در مصرع لکھ کر مخاطب پر اچھال یا پھینک رہے ہوتے ہیں اُس کا میں عینی شاہد بھی ہوں اور نشانہ بھی، شاہد تو اُن کے وہ کئی دوست بھی ہیں جو ان دنوں کسی وجہ سے ناراض ہیں اس لیے سچ کے مقابلے میں کذب بیانی کی مہم چلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کی فیس بک کی پوسٹوں پر اور ڈوبدو باتوں پر ہنس دیتے ہیں کہ انہیں منظور ہے پردہ ان کا۔ ان کے بہت سے دوست ان کے دسترخوان کے مستقل ساتھی ہیں اسی لیے ڈاکٹر صاحب کے کھانے میں نمک کم ہوتا ہے تا کہ وہ دوست نمک کا لحاظ کر کے کہیں ان کا لحاظ نہ کر جائیں۔ چنانچہ ان کے یہ دوست ان کی شخصیت کے اس پہلو سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی سادہ مزاجی کے سبب کانوں کے بے حد کچے ہیں، اور جو کوئی کسی کے بارے میں اچھا برا کہہ دے سچ مان لیتے ہیں، بدقسمتی سے ان دوستوں میں اچھا کہنے والے کم اور برا کہنے والے زیادہ ہیں۔ ہم نے سنا تو تھا کہ مومن کبھی ایک سوراخ سے دوسری بار نہیں ڈسا جاتا، مگر ڈاکٹر فرحت عباس اس قول کی تردید کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی سوراخ انہیں ڈس لیتا ہے، اور اگر کسی دن شومیِ قسمت یا خوبیِ قسمت سے انہیں کوئی سوراخ میسّر نہ ہو تو پھر ڈاکٹر صاحب خود اپنی آستین سے ہی کوئی سانپ نکال کر اپنے آپ کو ڈسوا کر اپنا نشہ پورا کر لیتے ہیں۔ ان کی عالی ظرفی ہے کہ وہ دوستوں کے خلاف ان لوگوں کی بات سنتے ہوئے کبھی کبھی مخاطب کو نرم لہجے میں ٹوک بھی دیتے ہیں، اور جن کے بارے میں ان کے کان بھرے جاتے ہیں ان کے سامنے ڈاکٹر صاحب اُن غیبت پسندوں کا ذکر بھی نہیں کرتے، البتہ مجھے کبھی کبھی ان کی باڈی لینگویج سے پتہ چل جاتا ہے کہ آج انہیں زہر کی کتنی مقدار دی گئی ہے، خود تو وہ ہر قسم کی باڈی لینگویج سمجھنے میں ضرورت سے زیادہ مہارت رکھتے ہیں مگر خود اُن کی باڈی لینگویج سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ میں اس معمے کو یوں حل کرتا

ہوں کہ کبھی جب وہ مجھے ضرورت سے زیادہ پروٹوکول دینے لگیں اور چائے کے ساتھ ڈرائی فروٹ سے توضیح کرنے کے علاوہ وٹامن کی گولیاں بھی عطا کریں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ آج میرے بارے میں ان کے کان خوب بھرے گئے ہیں، اور ان کی اس ادا پر میں خوش ہو کر دعا کرتا ہوں کہ کاش ہر روز کوئی مہربان میرے بارے میں ان کے کانوں میں زہر گھول جائے اور ان کی یہ مہربانیاں جاری رہیں۔ کہتے ہیں کہ حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی، نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔ مگر ڈاکٹر فرحت عباس کی دوستی تو اچھی ہے ہی، ان کی دشمنی دوستی سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ سچ پوچھیں تو چاہے کبھی وہ بطور دوست مجھ سے کبیدہ خاطر بھی ہوں، بطور معالج وہ ہمیشہ مہربان رہتے ہیں اور ان کا یہ حسنِ سلوک فقط مجھ تک ہی محدود نہیں، ابھی کچھ دن قبل ان کا ایک شدید بزرگ دوست جو اُن سے باقاعدہ گالم گلوچ اور کئی الزام تراشیاں کر کے گیا تھا، بیماری کی حالت میں القائم ہسپتال آیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا علاج شفایاب ہونے تک جاری رکھا، البتہ ان پر یہ ضرور واضح کر دیا کہ وہ اب ان سے ادبی لحاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ بطور معالج اور مسیحا کے ان کے ساتھ میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ میرے گھر میں میری یا کسی فرد خاندان کی شدید بیماری کی حالت میں جب مریض کو ہسپتال تک لے جانا ممکن نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب اپنے ماہر عملے کے ساتھ آئے اور گھر میں ہی علاج کی سہولت مہیا کر دی، گویا:

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

.....

خواتین و حضرات، بس ایک آخری بات کہہ کر یہ خاکہ ختم کرتا ہوں ورنہ ان پر تو بہت کچھ لکھنا باقی ہے، یار زندہ، خاکہ باقی۔ آخری بات میرا یہ سوال یا استفسار ہے کہ اتنا کچھ لکھنے اور پبلک ریلیشننگ کی ہر سہولت میسر ہونے کے باوجود آخر اُن کی شہرت کا گراف بلندی کی جانب سفر کیوں نہیں کر رہا؟ اِس کا میرے پاس تو بس ایک ہی جواب ہے کہ وہ ذاتی نام و نمود اور شہرت سے یکسر بے نیاز ہو کر اپنا کام کر رہے ہیں۔ ذاتی نام و نمود کے خواہاں تو سر توڑ کوشش کے باوجود بس ایک محدود مدت تک ہی منظر نامے میں موجود رہتے ہیں جبکہ ڈاکٹر فرحت عباس کا کام ان شاء اللہ انہیں تاریخِ ادب میں تا دیر زندہ و تابندہ رکھے گا۔

وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

چھلکوں کا سردار

علی رضا احمد

کیلے کے چھلکے کا ذکر ہوا اور اس سردار جی کا نہ ہو جن کی رنگت سڑک پر پڑے کیلے کے چھلکے کی طرح ہو جاتی ہے اور منہ سے یہ نکلتا ہے لو جی! آج پھر گھسیٹیں لگیں گی۔

سردار جی بچپن سے ہی چھلکے کو دیکھ کر چھلکنا شروع ہو جاتے ہیں.... دیکھا جائے تو یہ زندگی کیلے کے چھلکے پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑے ہونے کا نام ہے۔ سردار جی جب بھی گھر میں بور ہو رہے ہوں وہ گھر والوں سے کہتے ہیں لو جی میں ذرا تازہ دم ہو کر آتا ہوں اور گھر سے باہر نکلتے ہی کسی چھلکے پر پاؤں رکھ دیتے ہیں گویا یہ ان کا comfort zone ہے اور اس ''صحت مندانہ خودکشی'' کو فریش ہونا قرار دیتے ہیں اس وجہ سے شاید ان کا سارا سسٹم ریفریش ہو جاتا ہے حالانکہ پیر آنے سے پہلے اچھا خاصا قابل رشک انسان قابل اُشک ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ کیلے کے چھلکے سے اسی بارے سوال کیا گیا کہ تمہاری سردار جی سے کون سی دشمنی ہے کہ تم ہر دفعہ سردار جی کو ہی اپنے غضب کا نشانہ بناتے ہو۔ اس سوال کا

جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا میرے اوپر پاؤں دھرنے والے باقی تمام لوگوں سے چند قدم آگے پائے جاتے ہیں میں تو ایک طرح کا ایکسیلیٹر ہوں سردار جی کا منہ گھر کی طرف ہو تو آدھا راستہ ویسے ہی کافور ہو جاتا ہے... مگر میں ویسے ہی بدنام ہوں کیونکہ ایک بیکار چیز ہوں کسی کے کام تو آ نہیں سکتا بس پاؤں کے نیچے آتا ہوں یا قہوے کی پتی میں.... حالانکہ میرے اندر جو گودا چھپا ہے کبھی اس پر بھی پاؤں رکھ کر دیکھیں - میں ایک مزاحیہ کردار کی طرح لوگوں کو تفریح فراہم کرتا ہوں- میری پشت پر ایک بیوقوف پاؤں دھرتا ہے اور پھر دس بندے اسے دیکھ کر تفریح لیتے ہیں- آپ ابھی یہیں کچھ دیر انتظار کریں جیسے ہی کوئی سردار میرے اوپر پاؤں رکھے گا پھر آپ دیکھیں گے کہ کیسے سب تماشائی لطف اندوز ہوتے ہیں- ''ٹکٹ لے کے ہم بھی دیکھیں گے ہم دیکھیں گے'' میرے اوپر سے پھسل پھسل کر ان کی اتنی مشق ہو چکی ہے کہ بڑھاپے میں پھسل کے اور پھر یکدم کھڑے ہو کر یہ گنگناتے ہیں:

یہی تو میں حیران ہوں
ابھی تو میں جوان ہوں

کیلے سے مزید پوچھا گیا کہ تمہارا تعلق کس خاندان سے ہے اس نے کہا باقی پھلوں کا تو کوئی نہ کوئی خاندان ہوتا ہے جیسے سٹرس وغیرہ لیکن یہ کیلا اپنی ذات میں اکیلا ہی ہے میں پھلوں کا راجپوت ہوں بلکہ میں وہ ''بناتا'' ہوں جن کے نانا دادا سب کیلے ہیں، بھلے وہ بنانا ریپبلک کے ہوں...ایک بات اہم ہے جو اندر سے نرم ہوتے ہیں الزامات کی زد میں بھی وہی آتے ہیں- بہت کم چھلکے ایسے ہیں جو skit پروف ہیں جیسے وقار مجروح کہتا ہے کچھوا اور مگرمچھ واٹر پروف مچھلیاں ہیں وہ کچھ گھنٹے پانی میں رہ کر ڈوبے بغیر واپس کنارے پر لوٹ آتی ہیں- میں چونکہ پورا سال ٹھیلے کی زینت بنا رہتا ہوں اس لیے بدنام ہوں حالانکہ آم خربوزے کینو اور تربوز کے چھلکے سے بھی لوگ ''سٹمپ'' ہو جاتے ہیں لیکن پیروں کے نیچے سے زمین کا نکلنا اس ناچیز کی وجہ سے ہوتا ہے...

بقول سردار پولیدسنگھ وہ ایک دفعہ پولیس بھرتی کا ٹیسٹ دینے گیا تو پولیس والوں نے سب لڑکوں سے کہا کہ مستقبل کے چھلڑو اس کمرے میں آ جاؤ - انہی کی برادری کے ایک سائنسدان نے ایک ایسے کیلے کا بیج تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس کا چھلکا سرخ ہو اور وہ دور سے اشارے کی طرح نظر آ جائے یا پھر ہر

چھلکا وائی فائی کر دیا جائے لیکن بات گودے سے آگے نہ جا سکی ہے چنانچہ پھسل کر گرنے کا دورانیہ ابھی ایک دو سال کے لئے بڑھ گیا ہے۔ امریکہ میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق جب انسان قہقہہ لگاتا ہے تو وہ جب سب پہلے جس چیز پر نظر کرتا ہے وہ اس کی پسندیدہ ہوتی ہے بلکہ انسان پھینکتی کس کے بھی صرف اسی کو دیکھتا ہے جو اس کا ٹارگٹ ہوتی ہے اور سردار جی دونوں حالات میں صرف کیلے کے چھلکے کو ہی دیکھتے ہیں سردار کی بیوی اگر ساتھ ہو تو چھلکے کو دیکھ کر ان کے منہ سے یہ نکلتا ہے:

پھسلوں گا میں اب شام سویرے
اور پاؤں کو تیرے کوئی موچ نہ آنے دوں گا
پر دھکا میں نہ دوں گا

.....

سردار جی کیلے کے اندر سے دشمن ہیں حالانکہ قصور صرف چھلکے کا جیسے گدھے سے گرنے والا کمہار پر غصہ کرتا ہے۔ وہ اکثر یہ بھی کہتے ہیں "میں کنوں کنوں آکھاں مینوں کینوں کھوا دے"۔ چنانچہ رگڑیں کھا کر ایک منجی پر آرام کرتے ہوئے "منجیت سنگھ" کو دیکھ کر ان کے کسی بزرگ نے نصیحت کی کہ اوہ! "آرام زادے" آج کے بعد تم کیلے سے کنارہ کش ہو جاؤ اب بائیکاٹ کر دو اس کا اور بس آم کھایا کرو اور خریدا بھی اس وقت کرو جب بارش ہو رہی ہو۔ وہ اس بات ایسے پکے ہوئے ہیں کہ بادل دیکھتے ہی ان کے منہ سے پانی کے ساتھ یہ نکلتا ہے لو جی پا جی! آج پھر آم لانے پڑھیں گے۔ اس مجبوری کی وجہ سے کئی دفعہ انہیں مار پڑتے پڑتے بچی ہے کیونکہ جب وہ بارش ہوتے ہی دکاندار سے دو کلو آم تولنے کا کہتے ہیں تو وہ ہاتھ میں باٹ لے کر انہیں کاٹنے کو دوڑتا ہے اور ساتھ یہ کہتا ہے کہ اتنے پالے میں تیرے کیڑے پیو دے امب؟ چنانچہ اس پالے کے موسم میں بھی ان کا کسی نہ کسی دکاندار سے پالا پڑا رہتا ہے...

آم ہرگز ایک عام پھل نہیں جو ہر گرج چمک کے ساتھ آپ کو میسر آ جائے لہٰذا اب سردار جی بارش ہوتے ہی لنگڑے آم کی آئس کریم سے گزارا کر لیتے ہیں۔ بقول عطاالحق قاسمی "بہرحال لنگڑا آم بھی آموں کی دوڑ میں شامل تو ہے" بلکہ پوری تن دھی سے میراتھن سیزن میں اک یہی تو آخر تک کھڑا نظر آتا ہے۔ آم کا چھلکا بھی پھسلن کے لیے کسی کیلے کے چھلکے سے کم نہیں ہوتا بشرطیکہ کسی "عام" سردار کا ہو۔ اگر یہ آم کا چھلکا کسی کمپنی نے بنایا ہو تو اس برانڈڈ چھلکے کے اوپر پروڈکٹ لکھا ہو سکتا ہے اس پر پاؤں

رکھنے سے پہلے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ جیسے چہرے کو دھوپ سے بچانے والے مہنگے ترین سن بلاک پر لکھا ہوتا ہے ''دوا کو دھوپ سے بچائیں'' یقین مانیں جو دوا خود روشنی سے خراب ہو جائے وہ کسی کا رنگ روپ دھوپ سے سیاہ ہونے سے کیسے بچائے گی کئی لوگوں کو بندر کی طرح چھلکے ادھر ادھر پھینکنے کی عادت ہوتی ہے مگر سولر پاور سے چلنے والا بے چارہ سردار اور شاہ سوار ہی اس میدان جنگ میں کیوں سلپ ہوتا ہے؟ ایک سردار جی کے پتا نے اسے کئی دفعہ سمجھایا چھلکے سے اتنا نہ ڈرا کرو بس فاصلہ رکھا کرو۔ انہوں نے مزید واضح کیا کہ پیر اور چھلکے کا فزکس کے لحاظ سے سائنسی تعلق ہے کیونکہ دونوں کے نیچے تین نقطے ہیں حالانکہ ایسی بات ہوتی تو مگر مچھ اور کچھوے کے نیچے بھی ایسے ہی تین ہیں وہ کبھی چھلکے تو کیا پانی سے بھی نہیں پھسلتے...

ایسے ہی ایک سردار جی سڑک پر پر گرے ہوئے تھے ان کا سر پھٹ چکا تھا لوگ ان کی مدد کے لیے ان کے پاس دوڑے آئے اور ان میں بھی زیادہ تر سردار ہی تھے سردار جی نے ماتھے پر خون روکنے کے لیے ہاتھ رکھا ہوا تھا ساتھ کہہ رہے تھے مترو! یہ تربوز کا چھلکا پڑا آپ کو نظر آرہا ہے ان میں سے ایک بولا جی مجھے نظر آرہا ہے دوسرے سے پوچھا کیا تجھے نظر آرہا ہے؟ اس نے کہا جی جی وہ سامنے پڑا ہے وہاں موجود ایک عورت سے پوچھا کہ آپ کو بھی نظر آرہا ہے؟ اس نے بھی کہا جی سردار جی بڑے اچھے طریقے سے نظر آرہا ہے پھر سردار جی نے علی الاعلان پوچھا کیا سب کو نظر آرہا ہے ان میں سے ایک نے یہ بھی کہہ دیا کہ کس ''الو'' کو نظر نہیں آرہا؟ سردار جی کہنے لگے ''مجھے نظر نہیں آیا'' دراصل سردار جی نے کیلے کے چھلکے سے بچتے ہوئے تربوز پر پاؤں دھر دیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ زبان کے پھسلنے کو کسی کیلے کے چھلکے کی ضرورت نہیں ہوتی حالانکہ وہ اس کام میں چھلکوں کا سردار ہے، اس کا اردگرد کا ماحول بھی اسے پھسلنے کا موقع فراہم کرتا ہے ہماری تیسری دنیا کے راستے میں بڑی طاقتیں کیلے یا دوسرے پھلوں کے چھلکوں کی طرح ہیں اور یہ تیسری دنیا سوچ کے سکھ ہیں جب تک یہ تیسری دنیا انہیں دیکھ کر گھبراتی رہیں گی یہ ترقی کی ہر شاہراہ سے پھسلتے رہیں گے حالانکہ ان کے پاس اپنے بھی کئی قسم کے چھلکے ہیں جن کی اپنی پھسلن بہت ہے لیکن کمزور....

☆☆☆☆☆

نابغہء روزگار کتے

جون ۲۰۱۰ میں ماسکو آمد کے بعد جانداروں کی جن دو اقسام کی از حد کمی محسوس ہوئی وہ بچے اور پرندے ہیں۔ ماسکو درختوں میں ڈوبا ہوا شہر ہے۔ شہر کے عین وسط میں بھی درختوں کی بہتات ہے کیونکہ قانون کے مطابق شہر کا تیسرا حصہ درختوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ پرندے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سب سے زیادہ تو کبوتر ہیں اور چڑیاں بھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شہر میں چرندوں اور دوسرے جانوروں کی بہتات ہے۔ جانوروں کی کمی کو کتوں کی بہتات سے پورا کیا گیا ہے۔ بلا تخصیصِ جنس روسی زن و مرد کتے پالنے کے شوقین ہیں۔ یہاں میں نے بقول پطرس بخاری ایسے کتے بھی دیکھے جو بہت ہی کتے تھے اور ایسے بھی جو نہ ہونے کے برابر کتے تھے یعنی بالترتیب گدھے اور طوطے کی جسامت کے کتے۔ بہت دفع جی چاہا کہ مالکان سے دریافت کروں کہ انہوں نے یہ کتے کہاں سے اور کتنے میں بنوائے ہیں مگر روسی زبان سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے یہ آرزو دل ہی میں رہی۔ ان کتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بھونکتے نہیں۔ ایک دفع چشتی پرودی (وسطی ماسکو میں ایک تاریخی تالاب) پر ایک کتا بھونک پڑا۔ یہ ایک ایسا انہونا واقع تھا کہ وہاں سیر کے لیے آنے والے لوگوں نے یوں مجمع لگا لیا جیسے ہمارے ہاں عموماً مداریوں کے گرد لگ جاتا ہے۔ کتے کی مالکہ یوں شرمندہ شرمندہ لوگوں سے کتے کی اس ناخلفی پر معذرت خواہ تھیں جیسے کتے کی مناسب تربیت نہ کر کے ان سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

پطرس نے اپنے شہرہ آفاق مضمون میں اس ممکنہ خدشے کا اظہار کیا تھا کہ جانے کب ایک کتا بھونکنا بند اور کاٹنا شروع کر دے۔ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جب یہ کتے بھونکنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کرتے تو کاٹنے کے بدرجہ اُتم کٹھن مرحلے سے کیا خاک گذریں گے!۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہاں کے کتوں کے اس تہذیبی ارتقا پر ان کی تعریف و توصیف کی جائے کہ انہیں مطعون کیا جائے۔ ہمارے ہاں کے مروجہ نظریات کے بموجب تو ان کتوں کی مذمت کی جانی چاہیے کہ بھونکنے اور کاٹنے کی صلاحیت نہ رکھنے پر تو کتے کا مقصدِ حیات ہی فوت ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ آفرینش ہی سمجھ نہیں آتی۔

ایک بار اپنے فلیٹ کو جانے والی لفٹ میں سوار ہونے کو تھا کہ اس میں ایک معمر خاتون اور ان کے ساتھ بلا مبالغہ ریچھ کی جسامت اور شکل و شباہت کا ایک کالے اور بھورے رنگ کے درمیان کے کسی رنگ کا کتا دیکھا۔ لفٹ

راجہ عبدالقیوم

یوں بھی بہت چھوٹی ہے اور مجھے جانا بھی تیسری منزل تک ہی ہوتا ہے چنانچہ میں نے فوری طور پر لفٹ میں سوار نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اسی دوران اس کتے، جس کے آغاز اور اختتام کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا، انتہائی غیر کتیا نہ مگر بے حد نرم چخ چخ، چخ چخ یا تخ تخ کے درمیان کی کسی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

ماضی میں اس تلوق کے ساتھ تلخ تجربات کی روشنی میں غیر ارادی طور پر میں لفٹ کے در وازے سے کئی قدم دور ہو گیا۔ مگر خاتون نے روی تہذیب و اخلاق کے مظاہرے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی اور یوں بھی میرا یہ عمل اس کے کتے کے عمومی اخلاقی رویّے کے بارے میں غلط تاثر اور غیر حقیقی غلط فہمیوں کو بھی جنم دے سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے انتہائی مہذبانہ لب و لہجے میں مجھے بہ زبانِ روسی مطلع کیا کہ کتے کا رویہ اور زبان جارحانہ نہیں مفاہمانہ بلکہ دوستانہ تھی اور اس کی حرکات و سکنات اور اندازِ نشست و بر خاست سے اس کی صریحاً تصدیق ہوتی تھی سو میرا رویہ بھی مثبت، غیر متعصبانہ بلکہ دوستانہ ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ خاتون کی ساری گفتگو (جس کا ایک لفظ بھی مجھے سمجھ نہیں آیا) کا یہ لب لباب میں نے ان کے چہرے کے تاثرات، آواز کے زیر و بم اور ملتجیانہ کھڑے ہونے کے انداز سے اخذ کیا ہے اسے کسی بھی طور لفظی یا حقیقی ترجمہ تصور نہ کیا جائے۔

خاتون کے اس لفٹ میں سوار ہونے کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب تھا کہ میں کسی نہ کسی درجے میں ان کا ہمسایہ تھا اور ہمسائے کے حقوق تو مسلمہ ہیں اور ہمسائے کی ناراضگی کئی طرح کے خطرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے لفٹ میں سوار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس مرحلے پر مذکورہ کتے کے مناسب طرزِ عمل نے میری ڈھارس بندھائی اور مجھے محتاط انداز میں لفٹ میں سوار ہونے پر آمادہ کیا۔ اس سے خاتون کا چہرہ کھل اٹھا اور فاتحانہ انداز سے چمکنے لگا۔ انہوں نے بڑے پیار سے اپنے کتے کو دیکھا اور اس کے اخلاقِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ پر اس کی پیٹھ تھپک کر داد دی۔ مجھے یقین نہیں کہ اتنے بڑے بالوں اور اتنی موٹی کھال تک معمر خاتون کے منحنی اور استخوانی ہاتھوں کی داد پہنچ پائی مگر اس کے بعد کتے کے پر سکون اندازِ نشست سے میری جان میں جان آئی پھر بھی لفٹ کے دروازے کے کھلنے پر میری برق رفتاری خاتون کے لیے بھی اچنبھے کی بات تھی!

اتنے جسیم مگر حلیم کتے، جس کے اول و آخر کا پتہ لگانا اس کے لمبے بالوں کی دبیز تہہ نیز دُم اور تھوتھنی کی مکمل عدم موجودگی کی وجہ سے بہت مشکل تھا، سے سرسری تعارف کے چند روز بعد میرا سامنا ایک ایسے کتے سے ہو گیا جو اپنی مالکہ کے لمبے اوور کوٹ کی بیرونی اوپر والی جیب (جس میں کچھ دانشور اپنے قیمتی قلم لگا رکھتے ہیں) سے سر نکال کر گھما گھما کر اور با لکل گلہری جیسی آنکھیں مٹکا مٹکا کر بیرونی دنیا کے عمیق مشاہدے میں مصروف تھا۔ اس کتے کو کتا کہنا یا تو کتے کی توہین ہے یا گلہری

کی! اس کی جسامت تو ایک اچھے اور کھاتے پیتے ماحول میں پلی بڑھی خوش حال اور صاحب جمال گلہری جتنی تھی مگر دیگر اہم خصوصیات میں یہ کتا (اگر یہ کتا ہی تھا) گلہری سے بہت مختلف تھا۔ اس نے اپنے سر اور دونوں نسبتاً لمبے لمبے کانوں پر بالوں کے سنورے سنورے گچھے سجا رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں ہو بہو اُلو کی آنکھوں جیسی بڑی بڑی اور زرد تھیں جبکہ پتلی دم بالکل آخر میں جا کر اچانک بالوں کے ایک بڑے گول اور چوکور کے درمیان کی کسی چیز میٹریکل شکل کے گولے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سر اور کانوں کے بالوں کی رنگت یکسر مختلف یعنی بالترتیب بھوری اور سفید تھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتے کے بنوانے پر مالکن نے کثیر رقم خرچ کی ہو گی کہ ایسے عجوبوں پر فطرت تو اپنا وقت صرف نہیں کرتی۔ اس اور اس طرح کے مختلف رنگ و نسل، اشکال اور نوائح کے بے شمار کتے دیکھنے کے بعد میری رگ اشتیاق پھڑکی اور میں نے روس میں کتوں پر تحقیق و جستجو کی ٹھانی۔ موضوع دقیع، وسیع اور پیچیدہ تھا جبکہ وقت مختصر، وسائل محدود، اور جان ناتواں! پاکستانی نفسیات کے عین مطابق کارزار تحقیق میں بھی کوئی مختصر راستہ (شارٹ کٹ) ڈھونڈنے کی بھرپور کوشش کی اور یوں ایک دن کتوں کی نمائش Dog (Show) میں جا نکلا لیکن ٹھہریے، مجھے اس کتے کا اجمالی جائزہ لینے دیجیے جو ابھی ابھی ایک خاتون پتراشی پرادی (تالاب) پر چہل قدمی کرانے لائی ہیں۔

اس کی ٹانگیں باقی جسم سے کافی لمبی ہیں اور چہرہ ہو بہو چیگاڈر کے چہرے سے ملتا جلتا ہے (ویسے آپ کو معلوم ہو گا کہ چیگاڈر کا چہرہ ہو بہو کتے کے چہرے سے ملتا ہے ہاں مگر کتے کا چہرہ معیاری (standard) ہونا چاہیے۔ کیونکہ چیگاڈر کا چہرہ ہمیشہ معیاری ہوتا ہے)، جبکہ گردن مقابلتاً طویل مگر مہین ہے۔ ٹانگوں کا رنگ سفید، چہرہ بھورا، آنکھیں نیلی اور مزاج میں تیزی و طراری۔ مگر میں نے آپ کو اس کے حجم کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں! اس کتے کی طوالت محتاط اندازے کے مطابق دم کی نوک سے چونچ کے سرے تک ۲-انچ سے زیادہ ہرگز نہیں اونچائی یقیناً ۵-انچ ہے۔ وزن حتمی طور پر آدھا کلو ہے۔ (حال ہی میں خوراک نہ کھانے کی صورت میں، بصورت دیگر اس میں چند اونس کا اضافہ قرین قیاس ہے)۔ معلوم نہیں اس کتے کا یہ منفرد تناسب حاصل کرنے کے لیے جینیات کے ماہرین کی کتنی نسلوں نے شبانہ روز محنت سے اپنی زندگی اجیرن کی ہو گی۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ آپ میری باتوں کو غلو پر محمول کریں گے، میں نے اپنی بات کے ناقابل تردید ثبوت کے طور پر، کتے کی مالکن کی پیشگی اجازت سے قریبی تصاویر لے لی ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت پیش بھی کی جا سکے۔ صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

☆☆☆☆☆

بخار کا بیان [طنز و مزاح]

ویسے تو لاکھوں کروڑوں بیماریاں اس دنیا میں موجود ہیں، لیکن میری پسندیدہ بیماری بخار ہے۔ ارے ارے رکیے ---- یہ جملہ آپ کو سنا سنا سا لگ رہا ہے؟

جی--- کیونکہ ہم سب تیسری جماعت سے ایم_اے اردو کے امتحان تک پسندیدہ شخصیت کے مضمون کی شروعات کچھ ایسے ہی کر چکے ہیں۔

خیر بات بخار کی ہو رہی تھی۔ کیا کبھی کسی نے پوچھا کہ آپ کی پسندیدہ بیماری کون سی ہے؟ یہ کبھی نہ پوچھا جانے والا عجیب سا سوال ہے ------ کوئی پوچھے نہ پوچھے میں تو بتاؤں گی کہ میری پسندیدہ بیماری بخار ہی ہے۔ بخار میں جسم ٹٹ پنج کا شکار رہتا ہے اور بندہ منجے سے لگ جاتا ہے۔ خدمت کروانے کا اس سے بہترین موقع نہیں مل سکتا۔ گھر والے بھی کچھ زیادہ پروٹوکول دیتے ہیں علاوہ ازیں پینا ڈول بھی۔

مختلف قسم کے قہوہ جات پلائے جاتے ہیں۔ بیماری کا سن کر کچھ من چلے تیمارداری کو بھی چلے آتے ہیں۔

ویسے آج کل کے اور پرانے زمانے کے بخار میں بھی بڑا فرق ہے۔ پرانے زمانے میں کسی کو بخار ہونا تو بیمار کے گرد عید کا سا سماں لگنا۔ تیمار داری کرنے والوں کا تانتا بندھ جانا۔ اس تیمارداری کی آڑ میں سارے محلے کی خبریں اور رپورٹیں مفت میں مل جاتی تھیں۔ بیمار بندے کا دھیان اپنی بیماری سے ہٹ جاتا اور وہ جلد ہی بھلا چنگا ہو جاتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جب ہمیں بخار لاحق ہوا تو محلے کی ایک آنٹی تیمارداری کی غرض سے چلی آئیں - انہوں نے سوائے تیمارداری کے سب کچھ ہی کیا۔ علاوہ ازیں جب چائے کا دور چلا تو چائے میں چینی اس لیے نہ ڈالنے دی کہ انہیں شوگر تھی۔ البتہ ساتھ دھرے دو پیکٹ بسکٹ اور کیک مکمل پھڑکا گئیں۔ جس پر ہم ان کے عمدہ ان

سیدہ آمنہ ریاض

بیلنس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے اور دل سے صرف یہی آواز آئی کہ وائے دس کولا دری کولا دری کولا دری ڈی۔

پر آج کل اگر کسی کو بخار ہو تو مریض سے سو فٹ کا فاصلہ برقرار رکھنے کی ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ اس بخار کا کوئی مزہ نہیں۔ بندہ اکیلا ہی سڑسڑ مرے اور کچھ دن بعد ڈھیٹوں کی طرح خود ہی ٹھیک بھی ہو جائے۔

بخار کی بہت سی کرامات ہیں۔ جیسا کہ بندہ اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔ اسی حالت میں اگر اللہ بندے کو یاد کرلے۔ تو پھر نہ بخار رہتا ہے اور نہ بندہ۔ بخار کی اہم قسم گردن توڑ بخار کہلاتی ہے۔ باری کا بخار بھی عوام الناس میں بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ شادی کا بخار، امتحان میں اول آنے کا بخار، دبلا یا گورا ہونے کا بخار بھی عالمی شہرت کے حامل ہیں۔

جس طرح گونگے کی رمزیں گونگا ہی جانتا ہے اسی طرح بخار زدہ شخص اپنے بخار کو پہچانتا ہے۔ بخار میں آلو بخارا کھانا مفید ہو سکتا ہے یا نہیں اس پر سائنس کی کوئی تحقیق نہیں۔ البتہ اگر آپ کو آلو بخارا پسند ہے تو تیمارداری والے گھر وہی لے کر جائیں کیونکہ مثل مشہور ہے کہ مہمان کے آگے وہی کچھ رکھا جاتا ہے جو وہ لے کر جاتا ہے۔

بخار کی حالت میں اگر آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تو دو باتیں ہوں گی یا تو وہ آپ کو دوا دے گا یا ٹیکہ لگائے گا۔ اگر ڈاکٹر دوا دے تو ٹھیک، اگر ٹیکہ لگائے تو دو باتیں ہوں گی۔ یا تو آپ بہادروں کی طرح ٹیکہ لگوائیں گے، یا پھر چیخیں مار کر۔ بہادروں کی طرح ٹیکا لگوایا تو ٹھیک، اگر چیخیں مار کر لگوایا تو دو باتیں ہوں گی۔ یا تو آپ کو زبردستی پکڑا جائے گا یا پھر چیخ چیخ کر آپ کا گلا بیٹھ جائے گا۔ زبردستی پکڑ کر ٹیکہ لگوایا تو ٹھیک، اگر چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا تو دو باتیں ہوں گی۔ یا تو ڈاکٹر کہے گا کہ بکواس بند کر اگے ای مریض سمجھ کے تیرا بڑا لحاظ کیتا اے، یا پھر وہ آپ کو چنڈ کڈ مارے گا۔

حالت بخار میں دعا بھی قبول ہوتی ہے۔ جبکہ ترک عشق میں دعا ہرگز قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے بندہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ چھوٹا موٹا پیر سمجھنے لگ جاتا ہے۔ خیر اب کہ اگر آپ مبتلائے بخار ہوں تو سب سے پہلے اپنے لیے دعا کریں۔ کیونکہ اور تو کسی نے یہ فریضہ انجام دینا نہیں۔

بخار زدہ شخص کی بیوی کا بھی بڑا نام ہے۔ کیونکہ حالت بخار میں بندہ رب کے علاوہ اپنی زوجہ محترمہ کو ہی آواز لگاتا ہے۔ البتہ بخار اگر زوجہ محترمہ کو ہو، تو وہ بھی اپنے خاوند نامراد کو آواز لگاتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ علاوہ ازیں بخار میں زوج کا گلہ اور زوجہ کا مزاج کڑوا ہونے کے پورے چانسز موجود ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

لتا جی کے لیے ایک نظم

گم سم گم سم ساز پڑے ہیں سُر کی رانی چلی گئی
کانوں میں رس گھولنے والی
ڈوب گیا وہ صبح کا تارا، شام سہانی چلی گئی

اُجڑ گئی رنگوں کی دنیا
روٹھ گئی پھولوں سے خوشبو
خشک ہوا سنگیت کا دریا
کر کے دنیا کو دیوانہ وہ دیوانی چلی گئی

جب جب بھی وہ تان لگاتی
وقت کا پہیہ رک جاتا اور
سرگم اُس میں گُم ہو جاتی
اتر گئے راگوں کے چہرے لے کی جوانی چلی گئی

جیسے ہوں بچپن کے میت
جیون کے ہر درد کا درماں
مرہم جیسے اُس کے گیت
سات سُروں کا دریا تو ہے اس کی روانی چلی گئی

خوابوں کے دَر کھولنے والی
بکھر گئی وہ گُل آواز
اُس کے گیتوں کی مہکار
ایک سی آتی جاتی تھی
ملکوں کی سرحد کے پار
مست کیا ہر دل کو جس نے وہ مستانی چلی گئی

گم سم گم سم ساز پڑے ہیں سُر کی رانی چلی گئی

امجد اسلام امجد

اپنے جیسی ایک مثال

ہوا جب رقص کرتی ہے
نئے موسم کی بانہوں میں
تو پیڑوں اور بیلوں کی
تھکن سے چور آنکھیں بھی
نئے پتوں ، شگوفوں کے
سہانے خواب سے بوجھل
خزاں کے زرد بستر سے
بہار سرخ کی جانب
لہو کے گرم دھارے میں
عجب اِک کیف میں لرزاں
بہت تیزی سے بہتی ہیں
مگر خاموش رہتی ہیں

غلام حسین ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کو چُھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

خالد احمد کی یاد میں

میرا احساس، مرا فکر و فن آراستہ تھا
اک سخن وَر تھا کہ جس سے سخن آراستہ تھا

اک جہانِ سمن و نسترن آراستہ تھا
گل نما، نجم ادا، سیم تن آراستہ تھا

نطق و گفتار کا صد رنگ طلسمِ معنی
اِن فضاؤں میں کبھی نغمہ زن آراستہ تھا

طلعتِ غنچۂ فن پر تھی طراوت اس کی
نو بہ نو رنگِ نوا پیرہن آراستہ تھا

ایسا فن کار کہ گل رنگ ہوئی بزمِ فنون
ایسا گل کار کہ سارا چمن آراستہ تھا

دل کے احوال میں بھی، رنگِ خدوخال میں بھی
وہ بہر نوع، سرِ جان و تن آراستہ تھا

تا کریں کسب ضیا خاک نشیں ہم جیسے
سحر انداز و ستارہ سخن آراستہ تھا

اپنے محشر کدۂ جاں سے نکلنے کے لیے
کتنا تنہا وہ سرِ انجمن آراستہ تھا

محفلِ خوش نفساں میں وہ رہا قہقہہ بار
دل بہ پیرایۂ رنج و محن آراستہ تھا

پہلوے ہست میں رہتا نہ تھا نابود آہنگ
گو کہ نابود سے سارا بدن آراستہ تھا

بیشۂ فکر تہی رم ہے کہ اُس کے دم سے
دمِ رم خوردہ غزالِ ختن آراستہ تھا

''نم گرفتہ'' وہ گرفتارِ عدم تھا کب سے
ٹوٹنے کو کہیں آئینہ تن آراستہ تھا

پسِ منظر میں نہاں تھا سرِ منظر اس کا
حجلۂ جاں میں وہ انجم فگن آراستہ تھا

نیم وا آنکھ سے دیکھا، اُسے دیکھا تو سہی!
ایک یکتائے سخن تھا، سخن آراستہ تھا

نیم جاں، نیم بیاں، نیم ادا، نیم نگاہ
رُوے کہسار بہ حالِ دمن آراستہ تھا

ضعف میں بھی نہ گیا طعطنۂ فکرِ سخن
ضعف میں بھی وہ شکستہ بدن آراستہ تھا

شاخ در شاخ یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو خالد؟
ایک وہ تھا تو یہ سارا چمن آراستہ تھا

خالد علیم

الھڑ برس کا سنہری پل

محبت اپنے ہونے پر بہت اصرار کرتی ہے
گلابی سال کے روشن مہینے کی
کسی نیلی سی اک تعطیل کے ساحل پہ
موسم آن ٹھہرا ہے
سنہرے پل کا سایہ بھی سنہرا ہے
دلوں کی عمر جب الہڑ برس کی ہو
فضاؤں میں عجب سی اک کشش تحلیل ہوتی ہے
تو چپ کے آئنے میں
آنے والی اک ادھوری یاد کی
تکمیل ہوتی ہے
نظر بے ساختہ بس ایک جانب کھنچتی جاتی ہے
ستارے برف کی صورت پگھلتے ہیں
تمازت دھوپ کی ہو
چاندنی محسوس ہوتی ہے
کہ جیسے اجنبی تعبیر اپنے خواب سے
مانوس ہوتی ہے
ہَوا ٹھہری ہوئی بھی ہو
تو پردے رقص کرتے ہیں
کھنکتی سی ہنسی کے کانچ کھڑکی میں
بکھرتے ہیں
کہیں ٹوٹی ہوئی، بوسیدہ مٹی سے ہری
شاخیں نکلتی ہیں
سمے کے زرد ساحل پر
بہت مدت سے ناکارہ پڑی کشتی کے دامن میں
سفر کے پھول کھلتے ہیں
پرانے ریتلے ٹیلے کی بھوری جھاڑیوں میں
اک پرندہ چہچہاتا ہے
شفق ہوتا، جھجکتا کوئی آنچل مسکراتا ہے
جھکی آنکھوں کی خاموشی بھی اک اظہار کرتی ہے
عجب تکرار کرتی ہے
محبت اپنے ہونے پر بہت اصرار کرتی ہے

حامد یزدانی

میں اکیلا رہ گیا ہوں

ایک سایہ
جس کی الفت اور چاہت
زندگی بھر کا خزینہ
میرے سر کا سائباں تھا
موت کی آندھی کے ہاتھوں
گر پڑا ہے وہ شجر

اس شجر کی اس قضا سے
میرے سر کا سائباں۔۔۔
اب مرے سر پہ نہیں

میں اکیلا رہ گیا ہوں
جس طرح سے جھیل میں
کوئی کنول ہو اور تنہا
جس طرح سے ایک صحرا
اور اس میں ایک ساغر
ابر کی بدلی کو ترسے
سچ تو یہ ہے
کون انگلی تھام کر
لے جائے گا گھر تک مجھے اب
میں اکیلا رہ گیا ہوں

زندگی کے دشت میں
ویرانیاں ہیں خوف کا پہرہ ہے مجھ پر
میں اکیلا رہ گیا ہوں
میرے سر سے ہٹ گیا ہے
ابر کا ٹکڑا جو اک تھا
میں اکیلا دھوپ صحرا
کون دے گا اب مجھے پھر؟
زندگانی کی دعا

میں اکیلا رہ گیا ہوں!

اقبال سروبہ

بنجارا

سورج کی انگلی کو تھامے
چلتے چلتے
شام نگر میں آ کر ٹھہرا
اک بنجارا
شام سمٹ کر کچھ شرمائی
عارض و لب پر سرخی پھیلی
آنکھوں میں کاجل لہرایا
دھیرے دھیرے ڈوبتا سورج بنجارے کو
اپنی ساری کتھا سنا کر
شام کو آخری بوسہ دے کر
دور افق کے گہرے غار میں جا سستایا
بھیگی شام نے بنجارے کو گیتوں کی مالا پہنائی
اور چپکے سے بے سدھ ہو کر
رات کے پہلو میں جا لیٹی
بنجارا تو بنجارا تھا
رات سے کس نگری جاتا
تارے گنتے رات گزاری
دن نکلا تو بنجارے نے لمبی رات
کی تھکن کو اوڑھا
پھر سورج کے پیچھے پیچھے شام نگر کی
جانب اپنے قدم بڑھاتا
شام سے پہلے شام سے ملنے
گیت ملن کے گاتے گاتے
ندی کنارے آ بیٹھا ہے
ندیا کی لہروں پہ لکھی
بنجارے کی کتھا انوکھی
کون پڑھے گا

یوسف خالد

کوئی ہے جو مری آواز سن لے

رگوں میں خون جمتا جا رہا ہے
کوئی ہے جو مری آواز سن لے
یہ میری زندگی کا آخری فقرہ ہے
جو شاید ادھورا رہ گیا ہے
سڑک پر سلفیاں لیتے ہوئے بچوں کے
سارے قہقہے بھی منجمد ہو کر
پہاڑوں پر پڑے ہیں
ٹھٹھرتی ساعتوں میں سانس لینا
اس قدر مشکل۔۔۔ کبھی سوچا نہیں تھا
بدن میں برف
جیسے آریاں بن کر اترتی جا رہی ہے
مرا سارا بدن جیسے بغاوت پر اتر آیا
میں حرکت کا جو کہتا ہوں
تو میرے پاؤں، ٹانگیں، ہاتھ، بازو
اور زباں
سب ان سنی کر کے پڑے ہیں
مری سوچوں پہ جیسے برف جمتی جا رہی ہے
سفیدی اوڑھ کر لیٹے پہاڑوں کے بدن
مجھ کو اندھیری رات سے زیادہ
بھیانک لگ رہے ہیں
مری آواز جمتی جا رہی ہے

کفن ہاتھوں میں لے کر یہ پہاڑی راستے
میری طرف آتے
دکھائی دے رہے ہیں
کفن اوڑھے ہوئے
بچوں کے چہرے تک دکھائی دے رہے ہیں
فرشتوں کی مجھے
آہٹ سنائی دے رہی ہے

کوئی ہے جو مری آواز سن لے
کوئی ہے جو مری آواز سن لے

اکرم ناصر

بیساکھی

"چلے چلتے ہیں میلا دیکھنے صاحب!
ذرا ساٹھیریے!
کھولی کے کونے میں
مری تنہائی بیٹھی ہے
اسے بھی ساتھ لے آؤں،

رسوئی میں ذرا سی بھوک رکھی ہے
اسے رومال میں رکھ لوں ----"

"یہ بچے کتنے گندے ہیں
انہیں دیکھو ----
پڑی چیزیں اٹھا کر کھا رہے ہیں
کیا انہیں ہیضہ نہیں ہوتا ----؟
انہی جاہل گنواروں کی جہالت کے سبب
ہم کو کروڑوں ----ڈالروں کی ادویا
امپورٹ کرنی پڑ رہی ہیں --اف ----
نجانے کب انہیں احساس ہوگا----
----وہ مرا شفاف پانی ----؟
کیا ----؟ نہیں لائے ----"

"معافی چاہتا ہوں، جی!
زیادہ پیاس ہے تو میری ان آنکھوں سے
پی لیجے ----
بہت شفاف پانی ----
اس قدر شفاف جس میں
بستیوں کے زیرِ آب آئے
غمِ غارت شدہ تک
صاف دکھتے ہیں----"

"انہیں دیکھو!
جراثیموں بھرا پانی غٹا غٹ پی گئے
اندھے کہیں کے ----
ان کی آنکھیں کیا ----؟"

"حضو--رررر! اندھے نہیں ہیں ----
ان کی آنکھیں ہیں ----
بہت ہی خوب صورت ----
مغلیہ آنکھیں ----
بہادر شاہ تک سب ٹھیک تھا صاحب!
مگر اب ان کی یہ آنکھیں ----
اپاہج خواب جنتی ہیں"

"اپاہج خواب ----؟

رانا سعید دوشی

کیا مطلب ----
تو کیا ان بستیوں میں پولیو والے نہیں
آتے ----؟
کدھر ہے وہ ----
مرا --- رے بین کا چشمہ ----؟
خدایا --- اس قدر گرمی ----
چلو گاڑی میں چلتے ہیں"

"یہ اے۔سی۔آن ہے
صاحب ----"
"سنو!
تو کیا تم ----
اپنی اونگھتی آنکھوں کو نیندوں سے بھرے
خوابوں کی بیساکھی نہیں دو گے ----؟؟
اکیلے تم ----
کہاں بھٹکو گے اس دنیا کے میلے
میں ---- ؟؟"

"حضور! آرام فرمائیں
اسی میلے کی خاطر
اپنی تنہائی ----،
میں اپنے ساتھ لایا ہوں
مرا یہ بھوک کا رومال دے دیجے ---
یہ اے۔سی آن ہے ----
آرام فرمائیں ----"

الگ راستوں کا دُکھ [نثری نظم]

طلعت شبیر

مسافت

کسی دُور کے سفر کا

گورکھ دھندہ ہے

جہاں اجنبی ہم سفر بھی ہوتے ہیں

اور ہم سفر اجنبی بھی ہو سکتے ہیں

مگر اس بکھیڑے میں

کیا کیا جا سکتا تھا

کہ تیری سمت جدا تھی

میری سمت الگ

تیرے راستے جدا تھے

میرے راستے الگ

اور یوں

تمام عمر مجھے

الگ راستوں کا دُکھ

گھائل کیے رہا

برف کے قیدی [سانحہ مری کے حوالے سے]

وہ اپنے گھر سے نکلے تھے
لبوں پر گیت تھے
دل میں خوشی کے رنگ بہتے تھے
بہت خوش باش تھے
سب قہقہوں کی روشنی میں
گفتگو کے پھول اُگاتے تھے
وہ رنگوں، خوشبوؤں اور موسموں کے ساتھ
جیتے تھے

کہاں معلوم تھا
جن برف زاروں کی طلب میں
گھر سے نکلے ہیں
اُنھیں میں قید ہونا ہے
یہ ایسا سانحہ ہے
جس پہ خود اس برف کی
وادی کو رونا ہے
جہاں یہ برف کے قیدی
حیات اپنی گنوا آئے
کوئی، پُرسہ، تسلی اُن کو واپس لا نہیں سکتا
یہ موت اور زندگی کیا ہے؟
سمجھ میں آ نہیں سکتا

محمد نوید مرزا

شبِ آوارگی

آخری پہر
زمستانی شبِ تنہائی
ابرِ آوارہ بھٹکتا ہوا
اِس پار اُس پار
اور اک نرم پھوار
ٹھہرے پانی میں ٹپکتی ہوئی
بوندوں کی صدا
دھند کی شال میں
لپٹے ہوئے بھیگے اشجار
حاصلِ حسرتِ ناکام
بس اک ذرہ دل
اور اک لمبا سفر!
ایک بے معنی و بے سمت سفر
ایک سنسان سڑک
دور تلک۔۔۔!!

سجاد بلوچ

اس سے پہلے کہ۔۔۔

اس سے پہلے کہ بصارت نہ رہے
دیکھنے دو
مجھے اس جسم کے سب زاویے
اور سارے رنگ
اس سے پہلے کہ سماعت نہ رہے
میرے کانوں میں یہ آواز کا رس گھلنے دو
یہ ذرا زلف کی خوشبو
مری سانسوں سے
رگِ جان تلک جانے دو
اس سے پہلے کہ یہ احساس جدا ہو جائے
اس سے پہلے کہ کوئی ذائقہ میرا نہ رہے
مجھ کو چکھنے دو
یہ رخسار پہ اشکوں کا نم
مجھ کو چھونے دو
ذرا کانچ سے اپنے یہ لب
اس سے پہلے کہ مری پوروں میں ہمت نہ رہے
اس سے پہلے کہ تمھاری یہ نزاکت نہ رہے
اس سے پہلے کہ یہ مَیں
مَیں نہ رہوں
اس سے پہلے کہ یہ تم
تم نہ رہو!

دل کو دل سے رہ ہوتی ہے

عزیز فیصل

اک دن
اس نے فون پہ پوچھا:
''کیسے ہو؟''
میں ششدر حیران ہوا تھا
زندہ کیا امکان ہوا تھا؟
وہ پھر بولی:
''میں نے پوچھا کیسے ہو
کیا ویسے کے ویسے ہو؟''
لفظ کہاں تھے
جو دل کے ارمانوں کی تصویر بناتے
اور بتاتے
تنہائی کے اک گھنٹے میں
کتنے سال سما جاتے ہیں
روح میں کیسے درد پرانے در آتے ہیں
وہ پھر بولی:
''کیسے ہو
بولو، فیصل! اور بتاؤ
دس برسوں کا لمبا عرصہ کیسے گزرا، کیونکر کاٹا''
میری طرف سے پھر سناٹا
برکھا اپنے کومل قطرے بانٹ رہی تھی
اور مری آنکھوں میں میرا جلتا ماضی تیر رہا تھا
سچ کہتے ہیں
شب گزرے تو چاروں اور سحر ہوتی ہے
جن کو ٹوٹ کے چاہا جائے
ان کو خوب خبر ہوتی ہے

چشمِ رحمت

وہی دل ہے دل جو وفا کر رہا ہے
کہ خود کو نبی پر فدا کر رہا ہے

وہی حق پہ ہے، سب پہ حق ہے اسی کا
محمد کا حق جو ادا کر رہا ہے

اٹھی جس گھڑی چشمِ رحمت نبی کی
خدا اس گھڑی سے عطا کر رہا ہے

انھی کی اطاعت خدا کی اطاعت
کہ تعریف جن کی خدا کر رہا ہے

میں ہوں وہ مریضِ محبت، طبیبو!
مرا درد میری دوا کر رہا ہے

اسی بابِ رحمت کا میں بھی گدا ہوں
جہاں ہر سوالی صدا کر رہا ہے

بلا لے خدایا مجھے بھی مدینے
اویسؔ! انؐ کے در کی دعا کر رہا ہے

اویس جمیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مدح لکھوں میں کس کی خالد، کس کی حمد کروں
رحمت دو عالم ہیں، رحمت کل کے آئینہ دار

طرفین

نگہ پرکار کی صورت کسی مرکز پہ رہتی ہے
کبھی ہم اجنبیت کھینچنے والی لکیروں کی مثلث ہیں
کبھی نقطے کے الجھاؤ میں جیون بیت جاتا ہے
محبت کا مربع ایک مسطر سے نہیں لگتا

تکونِ خواب کو بھی دائرے میں لانا پڑتا ہے
کبھی ٹوٹے ستارے قوس کو چھو کر زمیں پر آن گرتے ہیں
کبھی مخروط خواہش جسم کے ہر زاویے پر رقص کرتی ہے
اندھیری رات کی جدول جوانی کے اجالوں
سے الجھتی ہے
کبھی ہم طاق راتوں میں دعائیں مانگتے ہیں
جفت ہونے کی

کہیں دکھ کا گراف اپنی حدوں سے پار ہوتا ہے
ریاضی دان کو جیومیٹری کے طے شدہ کلیوں
سے رخصت لینا پڑتی ہے
عمودی راستے خوشیوں سے کب ہموار ہوتے ہیں
عدد، گنتی اکائی کے اعادے وقت کی جھولی سے گرتے ہیں
محبت کا مربع ایک مسطر سے نہیں لگتا

زعیم رشید

بوڑھے پیڑ کی کہانی [نثری نظم]

تخیل کی اڑان میں
تصورات محوِ رقص ہیں
خاکی صحراؤں کی گزرگاہیں
کتنی دلکش ہیں
کہ ان کے مبہم راستے
فریبِ امید ہیں جیسے
دورِ کسی خزاں کی بھینٹ چڑھتا
بے برگ پیڑ جس کی سرد چھاؤں میں
آس کی ضعیفہ جس کے بالوں میں
چاندنی اتر آئی ہے
کسی پرانی عمارت کی عکاس ہے
ہوا میں سانحے ہونے سے قبل
وہ اکلوتا چراغ جو ہم نے
بوسیدہ کمرے کی
شیلف پہ سجا کے رکھا ہے
اس کی لو کی آہٹوں میں
سلگتی شاموں کا دکھ پنہاں ہے
کہ اس گہرے گھپ اندھیرے میں
اب روشنی پڑنے سے دراڑیں پڑتی ہیں
جیسے وحشتوں کے قیام میں
خلل ڈال دیتی ہیں
یہ راہیں جو گمشدہ مسافروں کی
واحد گواہ ہیں
یہ شہرِ خموشاں کا سفر سمیٹ لیتی ہیں
بادِ صبا جس کی ساعتوں میں
خوشبوؤں کی سرگوشیاں ہو رہی ہیں
اور وہ گونگے صدمے
بے حسی کے انگاروں پہ
جل رہے ہیں، بجھ رہے ہیں
وہم کی دیمک نے
مایوسیوں کا گھیرا تنگ کر دیا ہے
گویا آسمان کے خلاؤں میں
کہکشائیں ماند پڑ گئیں
یہ بادل کتنے بنجر ہیں
کہ ان میں اب بارشیں نہیں اگتی
سورج منتشر، آسمانی کنارے ویراں
کتنے پرکشش تھے میرے پیڑ
جن پہ آسیب زدہ سفید اندھیرا
نم تاریکیوں کا سحر طاری کیے ہوئے ہے
اور دور جھرنوں کے پہلو میں
چپ سادھے کوئل
وقت کے بوڑھے پیڑ کو
مفلوج ہوتی رونقوں کو
کوئی نئی منزل نہیں دکھا رہی
یہاں سرد مہری کے پہاڑ ہیں
وہ بیتی زندگی کا بین ہے گا رہی
یہاں ماتمی شور ہے، ہنگامہ ہے
یہ وقت کی تھکان کا آخری مرحلہ ہے
دریا پیاسے ہیں اب
ان میں آبِ حیات نہیں بہتا
اب امیدوں کی قندیلیں
ہوا کے سانحوں کی زد میں ہیں

اُم حبیبہ

ابھی ٹھہرو

ابھی ٹھہرو
ابھی کچھ دن لگیں گے
فضل کو خواہش بنانے میں

تمہیں اپنا سمجھنے میں، مجھے دل کو منانے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
ابھی ہم اپنی اپنی خوشبوؤں کو دل سے
ملنے دیں انہیں محسوس کرنے دیں
وفا کیا ہے؟ تقاضائے محبت کی حدیں کیا ہیں؟
حدوں کی سرحدیں کیا ہیں؟
تمھاری بھیگتی باتوں کی ندیا کی روانی میں
کہانی ہی کہانی میں
کوئی خواہش دلوں کی کوکھ سے پیدا
ہوئی تو کون دیکھے گا؟
ہمارے نام کی سچائی کو
اور خواہشوں کے بے نسب مہتاب چہروں کو

ابھی ٹھہرو
ابھی کچھ دن لگیں گے
رشتۂ بے نام کو ہم نام کرنے میں
کہانی کو کسی آغاز سے انجام کرنے میں
کہیں اظہار کرنے میں
ہمیں اقرار کرنے میں
ابھی ٹھہرو
ابھی کچھ دن لگیں گے

خالق آرزو

کرسمس

کنواری مریم کی زرد آنکھیں
عنابی ساعت پہ لکھ رہی ہیں
یہ کس کی آمد کا سبز نغمہ

سیہ زمانوں سے رخ بچا کر
زمیں کے دھانی بدن میں اترا
بشارتوں کا سفید لمحہ

فلک کے نیلے دروں کے اوپر
چمک کے اک چمپئی ستارہ
بس ایک اعلان کر رہا ہے
خدا زمیں پر اتر رہا ہے
خدا زمیں پر اتر رہا ہے

نعمان فاروق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم جاری تھی نادیدہ سہاروں کی تلاش
ہر قدم منت کشِ اغیار ہونا تھا ، ہوے

بیناٹر کے لیے

بشر ہی کے دم سے یہ رونق ہے قائم
یہ پھولوں کی خوشبو
سہانی سہانی
یہ معصوم غنچے چٹکتے ہوئے سے
یہ ساون کی چھاؤں بھری شام میں
لہلہاتے ہوئے
جن کی رونق نہ ہو تو، چمن کچھ نہیں ہے
یہ وادی یہ گلشن
یہ شبنم کے قطرے
جو سورج کی کرنوں میں ایسے چمکتے ہیں
جیسے سمندر میں موتی فروزاں
فضاؤں میں اڑتے، یہ خوش رنگ پنچھی
وہ کوئل کی کوکو
فضا کے ترنم میں
سر کی نزاکت سے
بادل کی لہروں میں
نکھری، مہکتی
ازل کی کہانی سنائے چلے جا رہے ہیں

بشر ہی کے دم سے یہ رونق ہے قائم
معطر فضائیں اسی گل سے ہیں اور
چمن کا اجالا اسی سے ہے باقی
مگر اب یہ رونق مٹانے چلا ہے
بناٹر جو اک فلسفی فتنہ پرور
جہالت کے رتبے میں ثانی نہ اُس کا
وہ محوِ عمل ہے

گلابوں کی نکہت ہوا میں نہ پھیلے
خزاں کی حکومت سلامت ہو دائم
یہ واقف نہیں ہے چمن کی بنا سے
سحر میں
صبا کے گلوں سے ملن سے
بہاروں کی رت میں
وہ بلبل کے دل گیر نغموں سے
جب ہر طرف صبح کا نور پھیلا ہوا ہو

خبر اس کو کیسے ہو شبنم کے لعلوں کی
ان سبزہ زاروں کی
خوشبو کے مسکن کی

جو آبا سمجھتا ہو ان بندروں کو
وہ شیروں کی شوکت،
دہاڑوں کی عظمت،
وہ عزت، حمیت سے واقف ہو کیسے؟
وہ ہرگز نہ ہوگا!

گلستان والو!
خبردار!
مہلک وباؤں سے اپنے چمن کو بچالو
گلستان والو!
چمن کے تحفظ کی خاطر
خبردار رہنا!

گوہر اعوان

نثری نظم

مدت ہوگئی ہے

تم سے بچھڑے

اب تو تم یاد بھی کم ہی آتے ہو

تعلق فراموشی کی آخری حد سے تجاوز کر چکا ہے

محبت کے مرقد پر اب یاد کا دیا نہیں جلتا

اپنا آپ ادھورا ہو کر بھی مکمل لگتا ہے

بادل چاند ہوا جگنو خوشبو رنگ اور برسات

من میں اجالا کیے رکھتے ہیں

کھو کر میں نے تمہیں مکمل پالیا ہے

"ہجر محبت کی تکمیل ہے"

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جنگ دو گز زمین کی خالد
ہم نے اک عمر لڑ کے ہاری ہے

خطوط

آصف ثاقب

بیاض کے سحر کار عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

یوم یک جہتی کشمیر کے ٹائٹل سے خوش رقم بیاض آچکا ہے۔ اس کے مطالعے کا فیض اٹھا رہا ہوں۔ رسالہ چلن کا ہے اپنی جھولی میں طرح طرح کی سوغاتیں بھر لیتا ہے۔ یوم یک جہتی کشمیر کے ٹائٹل سے حوصلہ بڑھا ہے۔ کوئی مضمون اگر کشمیر جموں سے متعلق ہو جاتا تو کیا بات تھی۔ باقی مدیر خالد احمد کی غزل کا ''اچھوتا پن'' باکمال ہے۔ اس غزل کو بار بار دیکھا اور ''سنا'' خوب کہا ہے:

دریا کی طرح خاک پہ خم ہے جبیں مگر
مجھ میں گھلے ہیں اوج کسی کوہسار کے
خالد چلا وہ مجھ کو سنا کر مری غزل
خود میری روح میں مرا خنجر اتار کے

سلیمان عبداللہ ڈارایک شمارے کے وقفے کے بعد آتے ہیں اور خوب آتے ہیں ان کے تصوف سے ہمت پر پرواز بڑھتی ہے۔ آنکھیں منور ہوتی ہیں۔ شوکت علی شاہ کی 'آبیتی' عجائبات دکھاتی ہے۔ سیاست میں چوکڑیاں بھرنے کا عمل یہاں واضح ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں طنزیہ عناصر سج دھج کر آتے ہیں۔ حمد اور نعت کا باب اُسی طرح 'بیاضیہ' ہے (بیاض رنگ) عقیدت کا تاثیر بھی وہی ہے۔ بشیر رزمی کی حمد کی امیجری از حد منفرد ہے وقار و اعتبار میں بے مثال ہے۔ ان کی ''عرض داشت'' ہے

تو نظر آتا نہیں — انت — خیر الخالقین
رحم کر بس رحم کر — انت — خیر الرحمین
علم کا در کھول دے — انت — خیر الکاشفین

مرزا آصف سنیے گا۔ اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما۔ حسن و خوبی کی بہت سی دل ربائیاں حمد و نعت کے حصے میں منقش ہیں۔ سبحان اللہ۔

غالب کی ایک غزل، میں جمیل یوسف صاحب نے غالب کے فنی استقلال کو بقولے بڑے بارسوخ پیرائے میں 'موضعِ مبحث' کیا۔ جمیل یوسف صاحب کی غالب سے 'خاطر داری' مثالی ہے۔ وہ جس سے محبت کرتے ہیں اسے دل میں بسا کر رکھتے ہیں۔ جمیل یوسف صاحب کی پاکستان، قائداعظم اور علامہ قابال سے قلبی نسبتیں عظیم ہیں۔

غالب کو وہ غزل کا سرتاج گردانتے ہیں۔ وہ ہر طرح جی خوش کرتے ہیں ناراض ہوں تو وہ بھی ایک شاعرانہ فعل ہے۔ خطوط میں احباب نے قلبی رعایتوں سے کام لیا ہے۔ نسیم سحر، ممتاز راشد لاہوری، آفتاب احمد ملک اور شفیق انصاری نے توجہ کی۔ ان کی مہربانی ہے۔ نسیم سحر نے 'پاکستانی ادب کے معمار' کتاب حاصل کر لی ہے۔ میں ان کا احسان مند ہوں وہ اس کتاب کے حصول میں دلچسپی رکھتے تھے، جو انھوں نے حاصل کر لی۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کی موجودگی سے رسالے کا احترام زیادہ ہوتا ہے۔ دخترِ پاکستان کی تحریریں اپنی جگہ اور تقریریں اپنی جگہ دونوں جگہیں بلا خیز، میں نے ان کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور افسانے بھی چند۔ یہاں بوئی میں ان کی کتابوں کی دستیابی، مرحلۂ دشوار سے کم نہیں۔ لاہور جاؤں تو پاؤں مگر اس بڑھاپے میں سفر ممکن نہیں۔ حال آں کہ بقولِ ظفر اقبال سفر ہی ممکن ہے، غزل اور نظم پر بات کروں، اتنے کاغذ کہاں سے لاؤں۔ خط کی طوالت سے مدیر نے منع کیا ہے۔

نسیم سحر

پیارے عمران منظور، نعمان منظور اور اعجاز رضوی صاحبان۔ سلام مسنون۔ فروری کا شمارہ موصول ہو گیا تھا، تین چار دن پہلے ہی مطالعہ بھی کر لیا تھا اور ارادے باندھ ہی رہا تھا کہ خط لکھا جائے۔ تین دن قبل ایک بہت عمدہ افسانہ نگار اور ایک متین و معتبر جریدے "لوح" کے مدیر اعلیٰ ممتاز شیخ کی رحلت کی اطلاع ملی، ابھی انہی کی یادیں دل میں سوگ منا رہی تھیں کہ آج لاہور سے سینیر ترین افسانہ نگار، ناول نگار، اور ماضی میں اہم سیاسی عہدوں پر فائز رہنے والی ادیبہ محترمہ بشریٰ رحمٰن کی اچانک وفات کی خبر نے مزید دکھی اور غمزدہ کر دیا۔ یوں جایئے کہ 2021ء کے بعد 2022ء نے بھی کوئی اچھا آغاز نہیں کیا۔ بس اللہ تعالیٰ سے سب کی خیر کی دعائیں مانگ رہا ہوں اور آپ کے علاوہ بیاض کے تمام قدر دانوں اور قارئین سے بھی اس دعا میں شامل ہونے کی درخواست کر رہا ہوں۔ کچھ ملکی حالات بھی ایسے ہیں کہ بلوچستان میں مسلسل دہشت گردی کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں، اور ہماری محافظ فوج کے افسران اور سپاہی اس میں اپنی جانیں پیش کر رہے ہیں۔ شاید ہم افغانستان کی جنگ میں مدتوں تک شامل رہنے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ملک کے دارالخلافے اسلام آباد کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی امن و سکون کی صورت حال خراب ہوتی جا رہی ہے، ڈاکے، چوریاں اور لوٹ مار کے واقعات روز افزوں ہیں۔

آپ کا شکریہ کہ آپ نے نئی کتب کی اشاعت کی نوید اُن کتب کے سرورق بیاض کے شروع کے صفحہ پر شائع کرنے کی خوبصورت روایت ڈالی، فروری کے شمارے میں میری تازہ ترین کتاب "تقاریظ و مضامین حمد و نعت" سمیت چار کتب کے سرورق شائع ہوئے ہیں۔ باقی تینوں احباب پروفیسر جلیل عالی، جناب اکرم جاذب اور جناب گل بخشالوی کو میری طرف سے تخلیقی اور اشاعتی سفر کے تسلسل پر دلی مبارکباد۔

حمد و نعت کے حصے میں جناب بشیر رزمی کی اس حمد نے سرشار کر دیا جس کے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ "انت خیر" سے شروع ہو کر اللہ تعالیٰ کی کسی صفت پر ختم ہوتا ہے۔ واہ واہ، کیا فنکاری اور قادر الکلامی ہے:

تو نظر آتا نہیں — انت خیر الخالقین
علم کا در کھول دے — انت خیر الکاشفین
میرے مولا بخش دے — انت خیر الغافرین

جناب بشیر رزمی جن دنوں ۷۰ء کی دہائی میں راولپنڈی میں تھے، اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں، اور اکثر ملاقاتوں میں خاور اعجاز اور مرحوم ڈاکٹر بشیر سیفی بھی شامل ہوتے تھے۔ تب بھی درویش صفتی اور تخلیق کی تازہ کاری ان کے اشعار میں نمایاں تھی۔ ان سے درخواست ہے کہ اپنا فون نمبر مجھے ارسال فرمائیں 0333 541 5091 پر، حمد و نعت کے حوالے سے ایک کتاب میں ان کی مدد درکار ہے۔ (اور اپنی کتابیں بھی انہیں پہنچانی ہیں)

حمد و نعت کے حصے میں جو اشعار خاص طور پر پسند آئے، یہ ہیں:

کس رخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام
خالد احمد

سارے قرآن میں اتری ہے فقط نعتِ نبی
اُس کے ہر لفظ میں اوصاف رقم تیرے ہیں
مقبل رحمانی

کھلتا ہے یہی آن کے سب پر دمِ آخر
کوئی نہیں دم ساز، مگر سیدِ عالم
خاور اعجاز

ذکرِ نبیؐ سے ذکرِ خدا کی طرف گئے
یعنی ثنا کے بعد دعا کی طرف گئے
مظہر حسین مظہر

جناب خالد علیم کی رباعیات ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتی ہیں، ان کی یہ رباعی خوب لگی:

ایسا بھی بے خبر کوئی دل ہو گا
جو اپنے پس و پیش سے غافل ہو گا

پہچان نہیں سکا جہالت کا مزاج
مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی جاہل ہو گا
خالد علیم

غزلوں کے بار بار مطالعے کے بعد اور انتخاب در انتخاب کے عمل سے گزر کر یہ اشعار "حاصلِ غزلیات" کے طور پر لکھ رہا ہوں:

منظر تھے دھیان میں لبِ جُو کسی دیار کے
آنکھوں میں تیرنے لگے بجرے خمار کے
خالد احمد

جب سے ملا ہے غم کو غرورِ سخن وری
کھلنے لگے ہیں رنگ مرے انکسار کے
خالد احمد

کچھ ذوقِ سماعت کا ہوا اُن کو تکلّف
کچھ ہم بھی ہوئے جاتے ہیں اشعار بلب سے
آصف ثاقب

نہیں ملا کبھی یکمشت محنتانہ ہمیں
ہمیشہ حصہ ہمارا ذرا ذرا پہنچا
انور شعور

گزری تمام عمر اسی گرم و سرد میں
اوپر فلک نہیں، کبھی نیچے زمیں نہیں
جلیل عالی

بحر کو یہ دُھن کہ ساحل کو بھی بڑھ کر کھینچ لے
موج کا یہ عزم ہے، بیرونِ دریا جائیے ہے
جمیل یوسف

افسوس یہ ہے کہ اس نے میرا
دنیا سے موازنہ کیا ہے
محسن اسرار

نژادِ نو کو بھی خود اعتماد ہونے دیں
بیاں کریں نہ حضور اپنے تجربات ابھی
سید قاسم جلال

ہر پیڑ سائباں نظر آیا ہے دھوپ میں
قدرت نے شامیانہ لگایا ہے دھوپ میں
گلزار بخاری

جو کچھ کسی کے سامنے کہنا محال ہے
ایسا نہیں کہ وہ پسِ پردہ درست ہو
منظور صدیق رضی

صحنِ کعبہ میں بھی بیٹھے ہو تو منہ پھیرے ہوئے
اس تعرش پہ بھی تائیدِ خدا چاہتے ہو
خاور اعجاز

سچ بولنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، مگر
جب سر پہ آ پڑی تو یہ ناچیز ڈٹ گیا
غلام حسین ساجد

ایک اک دوست سے مل کر یہ جتانا ہے مجھے
میں ہوں کچھ روز کا مہمان، مجھے جانا ہے
حسن عباس رضا

لاٹری روز نکلتی ہے کسی اور کے نام
میری آتی ہے کبھی اور نہ باری اس کی
راحت سرحدی

میری کشش میں کوئی کجی تو ضرور ہے
جو بھی مرے حصار میں آیا، بھٹک گیا
احمد حسین مجاہد

یونہی رہے گی سدا کشمکش تو یوں ہی سہی
ہوا کا اپنا مقدر، دیے کا اپنا نصیب
واجد امیر

کل رات ابرِ غم کے حوالے نہ مل سکے
کل رات بھی شمار کواکب نہ ہو سکا
شفیق آصف

میرے یاروں کی طرح تیز ہوا میں دیکھو
خشک پتوں نے ثمر بار شجر چھوڑ دیا
اکرم کنجاہی

اس بار برف کم تھی سو دریائے ہجر کو
آسودۂ ملال نہیں کر سکی ہوا
شہاب صفدر

روز آتی ہے مجھے خواب میں ملنے کے لیے
یاد کی جھیل کے اس پار پڑی رہتی ہے
اشرف کمال

بدلنا ایک حقیقت سہی مگر تیرا
یہ اتنا جلدی بدلنا سمجھ نہیں آیا
صغیر احمد صغیر

سنا رہا ہے لطائف وہ بادشاہوں کو
اداس شخص جسے خود ہنسی نہیں آتی
اسحاق وردگ

عجیب شخص ہوں خود کو غلط سمجھتا ہوں
مجھے ہمیشہ کوئی دوسرا درست لگے
سعید راجا

چکور قومی پرندہ تھا جن مچھیروں کا
انہی کے دل میں محبت نہ چاند کی جاگی
شاہد مالکی

اک قیامت تھی قیامت کی گھڑی سے پہلے
ایک والد نے جو اولاد سے قرضہ مانگا
دانش عزیز

آؤ کہ حرف نحو میں اک تجربہ کریں
تختی کے سب حروف میں ڈالیں مزید مد
فرخندہ شمیم

ایک دنیا میں ہے وجود مرا
ایک دنیا مرے وجود میں ہے
نوشابہ ہاشمی

ریت پر رکھی ہوئی تھی برف پانی بن گئی
اک خیال آیا تصور اور کہانی بن گئی
تصور اقبال

کسی آہٹ کی منتظر کھڑکی
کسی دستک کا پیاسا دروازہ
امر مہکی

وہ بون فائر کے پاس بیٹھی تھی اور شعلے
نمیدہ آنکھوں سے بات کرنے کے منتظر تھے
عاطف جاوید عاطف

میں جو اس بار ہواؤں کی حمایت کرتا
کون جلتی ہوئی شمعوں کی حفاظت کرتا
عمر قیاز قائل

اب رفوگر بھی نہیں اُس کو رفو کرنے کا
ہاں مگر چاک گریباں کہاں سمجھے گا
فرہاد ترابی

مرے آنگن میں ہے اک پیڑ وحشت کا
اسی سال اس پہ ممکن ہے ثمر آئے
احمد محمود

عجیب لمس ہے اُس کا مری ہتھیلی پر
وہ دل بناتی ہے اور دل دھڑکنے لگتا ہے
نثار محمود تاثیر

تماش بین سمجھتے رہے کہ کرتب ہے
چلی گئی تھی حقیقت میں جاں مداری کی
نثار محمود تاثیر

میری پرتیں نہیں کھلیں اب تک
دیوتاؤں کی شاعری تھی میں
جاناں ملک

کیمرہ وقت کی رفتار دکھاتا ہے مجھے
اب مری عمر سے تصویر بڑی لگتی ہے
جاناں ملک

یار دلنواز باقی احمد پوری کی غزل کے درج ذیل شعر کی معنویت مجھ پر کھلی تو حیرت ہوئی کہ سبز خصالی تو اسلام سے اور گنبد سبز سے منسوب ہے، اس کے مقابلے میں کسی سرخ سویرے کی خواہش کرنا ترقی پسندی کے دور کی یاد دلا رہا ہے۔ ممکن ہے باقی صاحب نے یہ شعر اس مفہوم میں نہ کہا ہو مگر قاری تو یہی معنی اخذ کرے گا۔ شعر ملاحظہ ہو:

اب کوئی سرخ سویرا ہی بچا سکتا ہے
مار ڈالا ہے مری سبز خصالی نے مجھے

کچھ نظمیں بہت اچھی لگیں جن میں ڈاکٹر خورشید رضوی کی ''ہوک''، امجد اسلام امجد کی ''محمد علی سدپارہ کے لیے ایک نظم''، اعجاز رضوی کی 'ایک اُداسی بھرے دن کے نام' اور رحیم رشید کی 'نظم' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نظموں کے بارے میں مشکل یہ ہے کہ ان کا کوئی اقتباس غزل کے کسی ایک شعر کی طرح لکھ کر بات نہیں کی جا سکتی اور پوری نظم دینا تو ظاہر ہے کہ ممکن نہیں ہے۔

خطوط میں احباب نے گذشتہ شمارے کی مختلف تحاریر پر اپنی پسند ناپسند کا اظہار کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ''فیڈ بیک'' تخلیق کاروں کے لیے بھی اچھی ہوتی ہے۔ جنوری ۲۰۲۲ء کے شمارے میں میری غزل کے ایک شعر کو جناب آفتاب احمد ملک نے منتخب اشعار میں شامل کیا ہے۔ تاہم اس کا قافیہ ''گھنن'' کی جگہ ''گن'' لگنے سے اس کی تفہیم مشکل ہو گئی ہے، درست شعر یوں ہے:

اپنے شعروں میں سانس لیتا ہوں
لگ گیا اس ہنر کو جب گہن تو؟

جناب طالب انصاری نے جناب جمیل یوسف کی نظم "رانی" کا ذکر کرتے ہوئے اندر کی بات بتا بھی دی ہے اور اسے محض گمان کہہ کر چھپانے کی کوشش بھی کی ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ کسی خاص شاعرہ کا نام نہ ہی لیتے۔ برسبیل تذکرہ اس مرتبہ کے خطوط میں فیض رسول فیضان "مین آف دا میچ" قرار پائے۔

سعدیہ بشیر کا فکاہیہ/انشائیہ کرسی اور گدھا پسند آیا۔ جناب سلیمان عبداللہ ڈار نے ہمیشہ کی طرح اپنی صوفیانہ اور فلسفیانہ تحریر سرابوں سے سرابوں تک میں دیر تک محو رکھا۔ ایسی تحریریں صرف ایک خواندگی سے ذہنی و روحانی نظام میں شامل نہیں ہوتیں۔ انہوں نے مضمون کے عنوان کی مناسبت سے غار حرا کی تاریکیوں سے نکلی ہوئی ہدایت کی روشنی کا کیا عمدہ انداز میں ذکر کیا ہے:

کاش، تیرے چشمۂ حیواں پہ آ پہنچے کبھی
یہ سرابوں سے سرابوں تک بھٹکتا آدمی

بشریٰ رحمٰن کا افسانہ "گودی" میں نے گذشتہ ہفتے اُس دن پڑھا تھا جب وہ ابھی حیات تھیں مگر اب دوبارہ دیکھا تو اُس میں بھی ایک ماں کی قبر اور اس کے ننھے بیٹے منور کا ذکر ہے جو ماں کی قبر سے لپٹ کر سو رہا تھا۔ شاید یہی ان کا آخری افسانہ ہو۔ شاید انہیں اپنے بلاوے کی خبر مل چکی ہو کہ وہ ایک درویش صفت خاتون تھیں۔

جناب جمیل یوسف نے مرزا غالب کی ایک غزل کی تشریح بلکہ تفسیر اپنے تخلیقی اور شعری انداز میں اتنی عمدگی سے کی ہے کہ عام قاری کا ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں۔ غالب کے شعر

"دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں"

کے ڈانڈے حجرِ اسود سے ملا: انہی کا کام ہے۔ غالب کی اس پوری غزل کے بیشتر اشعار کو نقیہ انداز میں تشریح کر کے جمیل یوسف صاحب نے کمال کر دیا ہے۔

جناب جلیل عالی کی شخصیت و فن پر خاور اعجاز نے اکادمی ادبیات پاکستان کے "پاکستانی ادب کے معمار" کے سلسلے میں جو کتاب لکھی ہے اس پر صمدانی صاحب کا مضمون اچھا ہے۔ باقی کے کچھ مضامین تو بالکل متاثر نہیں کر سکے، اگر مضمون نگار اپنے موضوع تک محدود رہ کر بات کرتے تو شاید متاثر بھی کرتے۔

بیشتر اس کے کہ اگلے شمارے میں کوئی مجھے بھی خطوط کا "مین آف دا میچ" قرار دے، میں یہیں اس خط کا اختتام کرتا ہوں۔

خیر اندیش۔

ممتاز راشد لاہوری

محترم عمران منظور، محترم اعجاز رضوی

آداب و تسلیمات!

"بیاض" (فروری 2022) زیرِ دست و نظر نواز ہوا۔ حسبِ روایت ایک شاندار ادبی شمارہ۔ آغاز میں نئی کتب کے رنگین سرورق دیکھنے کو ملے اور خالد احمد کی ایک عمدہ غزل بھی۔ ممدوں میں حسن عسکری کاظمی، علامہ بشیر رزمی اور رخشندہ نوید کی پیاری حمد تھیں اور نعت میں خاور اعجاز، سرور حسین نقشبندی کی نعت خوب لطف دیا۔ خالد علیم کی رباعیات خاصی فکر انگیز تھیں۔ افسانوں اور مائیکرو فکشن کے صفحات میں تین تحریروں نے زیادہ محظوظ کیا اور یہ بشریٰ رحمٰن، نجم رضوی اور نوین رومانہ کے افسانے تھے۔ شوکت علی شاہ کی "آبیتی" کی موجودہ قسط بھی رحیم یار خاں کے ان کے ڈپٹی کمشنر شپ کے دور کی کہانی تھی اور اس قسط سے بھی وہاں کے سیاسی، ملکی اور عمومی ماحول کی خاصی تفہیم ہوئی۔ حامد یزدانی نے ماضی کی ایک یاد بیان کی ہے جب نامور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر سے انھوں نے مکالمہ کیا تھا، یہ ایک یادگار تحریر ہے۔ "بیاض" کا یہ شمارہ بھی سب سے زیادہ

غزلیات ہی سے زرخیز شمارہ ہے۔ بیسیوں غزل گو شعرا کا اعلیٰ کلام پڑھنے کو ملا ہے۔ 'کتب بیتی''' والے حصے میں آپ نے میرا مضمون ''ابوالطاہر فدا حسین فدا کا خمستانِ سرمدی'' شامل کیا ہے۔ اس کے لیے بھی دلی شکریہ۔ بلاشبہ قیام پاکستان کے لگ بھگ کے شعرا میں فدا حسین فدا ایک اہم شاعر تھے اور ان کا یہ نعتیہ مجموعہ اہم کتاب تھی۔ ایک وضاحت کر دوں کہ ان کا سنِ وفات 2004 درج ہو گیا ہے، ان کا سنِ وفات اصل میں 2006 ہے۔ حیرت انگیز طور پر اندرونِ لاہور (Walled City) میں نثر نگاروں اور پنجابی شاعروں کے تو کافی نام ملتے ہیں مگر اردو شاعروں کے نام بہت کم ہیں اور فدا حسین فدا بلاشبہ وہاں کے اہم شاعر تھے۔ وہ اندرون موچی دروازہ لاہور کے باسی تھے۔ ''بیاض، کتب بیتی'' والے حصے میں پروفیسر جلیل عالی کے بارے میں صدام ساگر کا مضمون بہت اچھا لگا۔ مرزا عاصی اختر کے فکاہیہ مضمون ''واداوَلداوَہ'' نے بھی بعض مقامات پر حسِ ظرافت کو خوب مہمیز کیا۔ سعدیہ بشیر کا مضمون ''کرسی اور گدھا'' زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ شاہد ماکلی نے جاناں ملک کی شاعری سے بخوبی متعارف کرایا اور نثار محمود تاثیر کی شاعری سے بھی۔ ''خطوط'' کے صفحات میں نسیم سحر، جمیل یوسف، آصف ثاقب، آفتاب احمد ملک، فیض رسول فیضان، اشرف کمال، طالب انصاری اور محمد شفیق انصاری کے خطوط بڑے پُرمغز تھے۔ ان میں 'بیاض' کے شعرا کے بیسیوں اشعار کا انتخاب بھی پڑھنے کو ملا۔ شفیق انصاری صاحب نے میرا ایک شعر اپنے انتخاب میں شامل کیا۔ اُن کا دلی شکریہ۔

خیر اندیش

سید ریاض حسین زیدی

مدیرِ محترم عمران منظور صاحب!

مبارک ہو کہ آپ نے ہر آن، ہر دم، بیاض کی اعلیٰ روایات کو متواتر فروغ بخشنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہر ماہ وہ بھی ٹھیک کیم کو۔ ہمارے گھر میں 'بیاض' کی شکل میں ایک ایسا مرقع ادب جلوہ گر ہوتا ہے جس میں نظم و نثر کی نہایت معتبر تصویریں، اچھے مصوروں کے خوش نما نشتروں سے ہمارے دل میں خوشیوں اور بشاشتوں کو شاباش کہنے آ جاتی ہیں۔ آپ نے حمد و نعت کے صفحات کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دے کر جہاں اَن گنت نیکیاں کمائی ہیں وہاں حمد و نعت کہنے والے نئے لکھاریوں کو بھی ہلا شیری ملی ہے اور وہ بیاض میں اپنی نیکیوں کا کھاتہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شوکت علی شاہ کی آپ بیتی چشم کشا بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ حامد یزدانی کے حوالے سے محترمہ قرۃ العین حیدر کی زبانی یہ سن کر دکھ ہوا کہ ہمارے پاکستان میں اردو زبان کی بے حرمتی اور بے وقعتی میں ہر آن اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آئینِ پاکستان کی مسلّم ترین شق کہ اردو سرکاری زبان ہو گی، ہر مقام پر اس کا سکہ رواں دواں ہو گا۔ عدالتی زبان بھی ہو گی اور سرکاری اُمور کی انجام دہی بھی اسی کے توسط سے ہو گی۔ لیکن کمال ڈھٹائی سے ہم آئینِ پاکستان کی بے حرمتی نہایت دھڑلے سے کر رہے ہیں اور اُردو کی بے عملی کو مزید بے عمل کرنے کا شوق فضول پالے ہوئے ہیں۔ آخر اس پر کیوں نہیں احتجاج ہوتا ہے۔ اسمبلی کے فاضل اراکین اس کو اپنے احتجاج کا موضوع کیوں نہیں بناتے؟

میں 'بیاض' کے توسط سے اربابِ بست و کشاد سے درخواست گزار ہوں کہ اُردو کی آئینی بے حرمتی سے جلد از جلد نجات دلائیں۔

آفتاب احمد ملک

مکرمی و معظمی عمران منظور صاحب! آداب

ادبی مستقل روایت کے مطابق، وقت کی پاسداری کرتے ہوئے اور بقول ممتاز شاعر برادرم جمیل یوسف پانچ خصوصیات کا حامل جریدہ ''بیاض'' نظر نواز ہوا۔ جاذبِ نظر ٹائٹل 5 فروری یومِ یکجہتی کشمیر کی مناسبت سے اچھا لگا۔ موقع و محل، حالات کے بدلتے تقاضوں کے مطابق ماہنامہ کا نیا سرورق تخلیقی ذہن کا عکاس ہوتا ہے۔

سلیمان عبداللہ ڈار کا روحانی مضمون اور شوکت علی شاہ کی آپ بیتی اپنے خط سے پہلے دوبار پڑھتا ہوں۔ اس جریدہ ادب میں تمام اصناف ماہنامہ مطالعہ کے لیے کافی ذہنی و تحقیقی راشن ہوتا

ہے۔ شاہ داستان کا اب نیو ضلع چکوال اور تحصیل تلہ گنگ ہے جب دار فانی میں وارد ہوئے تو ضلع اٹک تھا اب موٹروے کی وجہ سے تلہ گنگ دور افتادہ نہیں ہے۔ شاہ جی کی تحریری سطور عموعی قارئین و قلم کاروں کے لیے ادبی حوالہ جات بھی ہیں مثلاً افقی دیکھیے۔ بے ہنگم داڑھی، کھوئی کھوئی نظریں، رحیم یار خان کی اندرگاندھی، عادتیں کہاں بدلتی ہیں۔ یہ تو مرنے کے بعد انسان کی قبر کا طواف کرتی ہیں۔ مسائل پسند مولوی اور خطر پسند انتظامیہ'' (صفحہ نمبر 55-50)

حامد یزدانی صاحب کا یادگار انٹرویو بہت خوب 1991 کی ادبی تاریخ کی عینی شاہد قرۃ العین حیدر (ناول نگار) سے ادبی مکالمہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ انٹرویو سے نوآموز لکھاریوں کو تحریک ملتی ہے ناول نگاری کی دنیا میں خواتین گروپ میں قرۃ العین حیدر کا بڑا نام ہے۔

جمیل یوسف کا مضمون بعنوان ''غالب کی ایک غزل'' حقیقتاً تنقیدی بھرپور جائزہ ہے۔ مشتاقانِ سخن کا تجسس ابھی تک تشنہ ہے۔ غزلیہ اشعار کی خوبصورت پیرائے میں تشریح کی ہے۔ (صفحہ نمبر 67)

انور شعور کی شخصیت و شاعری پر شاعر علی شاعر کا محققانہ انداز تحریر کمال ہے۔ معنی خیز اشعار کا حوالہ دے کر موصوف کی شاعرانہ صلاحیتوں بصورت ''کلیات انور شعور'' پیش کر دی ہے۔ ''ان کی شاعری کے آئینے میں یہ تمام تصویریں جوانی اوڑھے نظر آتی ہیں'' (صفحہ نمبر 73)

معروف شاعرہ، خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر (مرحومہ) پر عامر رضوی کا معلوماتی سوانحی خاکہ خاصا دلچسپ ہے (1952-1994) جان کیٹس کی طرح نوجوانی کی 42 بہاریں دیکھ پائی تھیں۔ گلابی جذبوں کی ترجمان شاعرہ کو برادرم احمد جمیل نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ (صفحہ نمبر 215)

وہ جس کے نام کی بکھری نگر نگر خوشبو
ادب سے روٹھ گئی آج وہ نگر خوشبو
ادب میں اس کا بدل کوئی بھی نہیں ہے جمیل
سخن میں اس نے بکھیری جو معتبر خوشبو

عامر رضوی کی یہ رائے ادبی نقطۂ نگاہ سے کافی وزنی ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کی شاعرات اور ادب نگار خواتین کی طرح خود کو روایتوں کے پنجرے میں قید نہیں رکھ سکی تھی۔ (صفحہ نمبر 77)

غزلیات کے صفحات پر درج ذیل جید شعرا عظام کا تخلیقی کلام بار بار پڑھا

ہر آہ نغمۂ نصرت کی گونج بن جائے
مگر کہیں کوئی گیتوں کا آبشار تو ہو
عمل کو فکر ملے، فکر کو عمل۔ لیکن
فنکار کار کو حاصل شریک کار تو ہو
خالد احمد

کچھ ذوق سماعت کا ہوا اُن کو تکلف
کچھ ہم بھی ہوئے جاتے ہیں اشعار طلب سے
کردار کی توثیق ہو تو جگ میں ہے عزت
اعزاز کبھی ملتا نہیں نام و نسب سے
آصف ثاقب

طرفہ تماشا ہی کہہ لیجے
نفرت جمیل پیار کے ہاتھوں

حیرت کی تصویر بنے ہیں
پیکر پُراسرار کے ہاتھوں
ممتاز راشد لاہوری

اُس کا دامن بھی مرادوں سے نہ ہو گا خالی
میری جھولی بھی دعاؤں سے بھری رہتی ہے
روز آتی ہے مجھے خواب میں ملنے کے لیے
یاد کی جھیل کے اُس پار پڑی رہتی ہے
اشرف کمال

گرد ماہ و سال نے دھندلا دیے سارے نقوش
دل سے اُس کی یاد کا پرتو بھی مٹتا جائے ہے
جمیل یوسف

اُس کو ملتا نہیں وہ باہر بھی
جس کے اندر خدا نہیں ہوتا
امجد اسلام امجد

گزری تمام عمر اسی گرم و سرد میں
اوپر فلک نہیں کبھی نیچے زمیں نہیں

جلیل عالی

میں قبیلے میں معزز تھا اسے یاد رہا
بھولتا کیسے زمانہ مری مرداری کا

حسن عسکری کاظمی

شکاری ہر پرندے کو ہی رزقِ تیر کرتا ہے
جو زد میں آئے گا اڑنے کو اپنے پر بھی تولے گا

رشید آفرین

پیاسا ، ہی نا پیا ہوں جب پھر منزل پر پہنچے کون
زرداروں کو دیکھ کے حالت میری تو شرمائی آنکھ

اقبال سروبہ

خود کو پتوں میں چھپاتے ہیں وہ پنچھی ، جن کو
آگ جنگل میں لگی کاٹ کے پر چھوڑ دیا

اکرم کنجاہی

یاد کا کیل نکالا نہ گیا جب میں نے
دل کی دیوار سے تصویر اتاری اُس کی

راحت سرحدی

یہ مت سمجھ کے مجھے کچھ خبر نہیں تیری
فقیر پوچھتا رہتا ہے سب سے حال ترا

ریاض رومانی

ایک آوارہ نظر نے سحر
شاہد کو مشہور کیا

حسنین سحر

اونچی حویلیوں کے وہ چشم و چراغ تھے
بچھڑے تو قیل و قال نہیں کر سکی ہوا

شہاب صفدر

ہوا چلی تو یہ اڑتے پھریں گے شہر بہ شہر
چمن میں بکھرے ہوئے جو شکستہ پر ہیں مرے

خورشید ربانی

میں آٹھ سال سے ان وادیوں میں رہتا ہوں
یہ کوہ قاف ہے لیکن پری نہیں آئی

اسحاق وردگ

ان تذکروں میں ایک بھی مخلص نہ مل سکا
اس داستانِ خلق میں مخلوق مر گئی

سعدیہ بشیر

پار دریا کسی نے پکارا مجھے
ان پرندوں کو ہی پر نہیں چاہیے

رخشندہ نوید

وہ بوڑھا جس کو سارے لوگ دیوانہ سمجھتے تھے
تھا اپنے قہقہے ، شعلہ بیانی ڈھونڈتا پھرتا

اکرم ناصر

ہمارے قطبی خزیرے پہ رات تھی اب تک
مہینوں بعد یہاں دھوپ سی کوئی جاگی

شاہد ماکلی

ماہانہ دو نئے شعرا (مرد + خواتین) کا تعارف شاہد ماکلی کا ہی کھوج ہے جو ان تخلیق کاروں کا تعارف کرا دیتے ہیں۔ معاشرتی رویوں پر قلم آرائی افسانوں میں نمایاں ہے۔

چار نئی اشاعتی کتب کے فرنٹ ٹائٹل دیکھ کر مصنفین کو دلی مبارکباد۔ تبصرہ جات پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کتاب مطالعے کے میز پر ہے۔

خطوط نگار مبصر بھی ہیں جو احباب کے کسی تعارف کے مختصر یا طویل انداز میں تنقیدی آرا دیتے ہیں۔

خطوط نویسی بھی ادبی صنف ہے فروری کے شمارے میں ان ممتاز شعرا نے خطوط نگار دوستوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ آصف ثاقب + ممتاز راشد لاہوری + اشرف کمال صاحبان کا بصمیم قلب ممنون ہوں۔

15 دسمبر 1985 میں زندہ ادبی شخصیات کا گروپ فوٹو گویا ایک صدی کی تاریخ سامنے آ گئی۔ ان قد آور شخصیات سے ملاقاتیں رہی تھیں۔ عمران منظور صاحب کینیڈا کے دورے پر ہیں۔

241 صفحات کی اشاعت پر ماہنامہ بیاض، کی فعال و متحرک انتظامیہ کی کاوشوں کی داد دی جاتی ہے اور خالد احمد کی غزل کا شعر قارئین ادب کی نذر:

جب سے ملا ہے غم کو غرورِ سخن وری
کھلنے لگے ہیں رنگ مرے انکسار کے

فیض رسول فیضان

مخدومی و محترمی جناب مدیرانِ بیاض، آداب و تسلیمات!

فروری کا شمارہ صرہ نواز ہوا۔ سرورق، زنجیر انگیز اور پرچم آمیز ہے جس کی معنوی گہرائی اور پہلو دار گیرائی سے اپنا شعر یاد آ گیا:

جیسے کوئی فریم ہو تصویر کے بغیر
فیضان ہم ادھورے ہیں کشمیر کے بغیر

پس ورق پر ادبی اصاغر و اکابر کے جھرمٹ میں جنت مکانی قاسمی صاحب کی زیارت سے بہت دیرینہ یاد آ ورد تازہ ہو گئی۔

فیضان بعد غالب و اقبال و میر کے
احمد ندیم قاسمی سب سے عظیم ہیں

دو سو اکتالیس صفحات کے زیرِ نظر شمارے میں بھی حسبِ روایت، نگارشات نظم و نثر کی ایک کائنات سمائی ہوئی ہے۔ اور اکثر مقامات پر یہ احساس دامن گیر ہوتا ہے۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

نئے شعرائے گرامی سے مؤدبانہ التماس ہے کہ براہ کرم، اشاعت سے قبل اپنا کلام کسی بزرگ شاعر کو دکھا لیا کریں۔ مزید رنگ لگ جائیں گے۔ سینئیر اور استاد شعرائے کرام سے عاجزانہ التجا ہے کہ شاعری کی نئی پود کے لئے زہ دن کے ساتھ، عملی و اصلاحی اور حوصلہ افزا توجہات بھی وقف و مرحمت فرمائیں۔ آپکا سایہ شفقت سلامت رہے۔

حضرت جلیل عالی کی قدر دانی اُن کی زندگی میں ہو رہی ہے۔ ڈھیروں مبارکباد کا گلدستہ پیش خدمت ہے۔ شاہد ماکلی صاحب کا تعارفی سلسلہ، لائقِ تحسین ہے۔ از راہ عنایت اپنی انتقادی رسائیوں کا رُخ، سینئر شعراء کی جانب بھی مبذول فرمائیں۔ سلامتی کی نیک تمنائیں آپ کے لئے۔

ایک اُداسی بھرے دن کے نام، جناب اعجاز رضوی کی نثری نظم ہے اور علامتی تفلسف کے ساتھ جبر و قدر کا خوبصورت و جاندار مرقع ہے۔ بے حد داد۔

شاعر علی شاعر صاحب کی تحریر، مدلل مداحی نہیں بلکہ حقیقی خراجِ محبت ہے۔ یوں بھی جناب انور شعور، عہدِ حاضر کے زندہ شعراء کی کسی بھی فہرست میں ٹاپ فائیو پر ہی نظر آتے ہیں۔ اُن کے دو لازوال شعر:

چاند کو جب قریب سے دیکھا
دور سے دیکھنے کی شے نکلی

دروازہ کھول دیجئے تاخیر کے بغیر
دیوار نے کلام کیا ہے ابھی ابھی

خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر کی یادیں تازہ کی گئیں۔ (مرحومہ) کا شعری مقام، ادا جعفری، پروین فنا سید اور زہرہ نگاہ کی رفعتوں سے ہم آغوش ہے۔

خوفِ فسادِ خلق سے جان کی امان پاتے ہوئے عرض گذار ہوں کہ نثری نظموں والے حصے کا نسبتاً بہتر متبادل بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا فرماتے ہیں مدیرانِ والا شان اس باب میں؟

گذشتہ شمارے کے منتخب، کیف آور اور روح پرور اشعار، پیشِ قارئین ہیں۔

حمد و ثنا سے مل گئی تسکینِ شکر ہے
انعام تو نے یہ بھی مجھے بے بہا دیا
حسن عسکری کاظمی

رحم کر بس رحم کر
انت خیر الراحمین
بشیر رزمی

پناہ دیتا ہے وہ ذوالجلال و الاکرام
کہ اس جناب میں تفریقِ نیک و بد نہیں ہے
رخشندہ نوید

صدائے صلِ علیٰ آئی ہر طرف سے مجھے
یہ کس کا نام لبوں سے مرے ادا ہوا ہے
محمد یٰسین قمر

کھلا ہے یہی آن کے سب پہ دمِ آخر
کوئی نہیں دم ساز مگر سیدِ عالم
خاور اعجاز

عمر بھر بات تیری ایک نہ مانی ہم نے
شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے ہم تیرے ہیں
عقیل رحمانی

رنگوں نسلوں کے ٹوٹ جاتے ہیں
سارے فخر و گماں مدینے میں
افتخار شاہد

نعت کہنا چاہتا ہوں نعت ہوتی ہی نہیں
دوستو حدِ ادب ہے بات ہوتی ہی نہیں
اکرم ناصر

دریوزگی کے واسطے خورشید و ماہتاب
شہرِ نبی؟ کے صبح و مسا کی طرف گئے
مظہر حسین مظہر

ہر مصیبت کٹ گئی، دکھ درد سے راحت ملی
نام صدقِ دل سے جس نے بھی پکارا آپ کا
طلحہ غفور

اُن پہ درود بھیج کے میں نعت کہتا ہوں
اس دل میں اس لئے بھی مدینہ ہے نعت کا
علی آرش

منور کر دیئے کعبے نے منظر
ہوئے شامل مدینے کے اُجالے
آصف ثاقب

نعت کیا ہے بس آپ کی تعریف
رب بھی کرتا ہے آپ کی توصیف
سید ریاض حسین زیدی

تھی مری جو بھی ابتداء، اُس سے مجھے نہیں غرض
ہو مری اس پہ انتہا، صلِ علیٰ محمدؐ
مرزا آصف رسول

جب سے ملا ہے تم کو غرورِ سخن وری
کھلنے لگے ہیں رنگ مرے انکسار کے
خالد احمد

بے امکانی کو نذرِ امکان کریں
کچھ جاننے بوجھنے کا سامان کریں
معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا
آ، اپنی جہالت کا اعلان کریں
خالد علیم

حیات عرصۂ محشر سے کم نہیں خالد
مگر کسی کو قیامت کا انتظار تو ہو
خالد احمد

ناراض ہیں کچھ لوگ تو راضی بھی ہیں کتنے
ملتا ہوں محبت سے میں اس شہر میں سب سے
آصف ثاقب

ہو گا دیکھو یہیں کہیں موجود
کوئی ہو کر فنا نہیں ہوتا
امجد اسلام امجد

عبادتیں تو بہت کی ہیں شیخ جی تم نے
تمہاری ذات سے بندوں کو فیض کیا پہنچا

☆

ہوئی تھی صرف غزل بھیجنے کی فرمائش
مگر شعور بہ نفسِ نفیس جا پہنچا
انور شعور

گذری تمام عمر اسی گرم و سرد میں
اوپر فلک نہیں کبھی نیچے زمیں نہیں
جلیل عالی

افسوس یہ ہے کہ اُس نے میرا
دُنیا سے موازنہ کیا ہے
محسن اسرار

سائباں دھوپ کا سورج نے بنایا مجھ پہ
آ گیا لوٹ کے موسم بھی شجر کاری کا
حسن عسکری کاظمی

ساری ہوا کو ایک جگہ جمع کر کے میں
بچے کے کھیلنے کو غبارہ بناؤں گا
نسیم سحر

جنہیں رغبت ہو طوفاں سے وہ دریا پار جائیں گے
وہ ڈوبیں گے سرِ ساحل سفینہ جن کا ڈولے گا
رشید آفریں

خیالِ یار کی سرشاریاں میسر ہیں
نفس نفس میں انہیں مشکبار دیکھا ہے
سید ریاض حسین زیدی

جہاں سے گزرا تھا وہ قافلہ بہاروں کا
وہاں پہ بکھرے ہیں اب بھی گلاب یادوں کے
احمد جلیل

تری نگاہ پہ اسرار فاش ہوں کیسے
کیا ہے تو نے کبھی ذات و کائنات پہ غور؟
سید قاسم جلال

دیوار آ گئی کوئی سورج کے سامنے
دنیا سمجھ رہی ہے یہ سایہ ہے دھوپ میں
گلزار بخاری

بے شک وہ لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہو مگر
شیریں زبان ہو لب و لہجہ درست ہو
صفدر صدیق رضی

سوچتا ہوں کہ کتابوں میں رکھوں یا دل میں
پھول بھیجا ہے کسی چاہنے والی نے مجھے
باقی احمد پوری

بادِ مشرق ہی چلی ہے نہ کوئی بادِ شمال
سانس لینے کے لیے کتنی ہوا چاہتے ہو
خاور اعجاز

دیا بھی نام کا اُن کے جلا دیا گیا ہے
وہ جن کو بجھنے سے پہلے بجھا دیا گیا ہے
طارق بٹ

سچ بولنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر
جب سر پہ آ پڑی تو یہ ناچیز ڈٹ گیا
غلام حسین ساجد

رنگ و خوشبو لٹایا کرتے ہیں
پھر یہ مرجھا بھی جایا کرتے ہیں
پیار پھولوں سے اس قدر ہے مجھے
شاخ سے توڑتا نہیں ہوں میں
اعجاز کنور راجہ

آخری حکم ہے تعمیل تو کرنی ہو گی
چاہے جیسا بھی ہو نقصان مجھے جانا ہے
حسن عباس رضا

بھر صورت خلا باقی رہے گا
بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں میں
یعقوب پرواز

کیا کچھ ہے بھلا حسن کی دیوار کے اُس پار
دیکھا ہی نہیں شہرِ محبت سے نکل کر
علی اصغر عباس

آج بھی کل کی طرح جس کو نہ مزدوری ملی
سوچتا میں ہوں کہ کس منہ سے وہ گھر جائے گا
منظور ثاقب

ہم ملبے میں ڈھل جائیں گے
اک گرتی دیوار کے ہاتھوں
ممتاز راشد لاہوری

شوق سے آؤ مرے شہر میں ٹھہرو حامد
میں وہی ہوں جسے ویرانے میں تم چھوڑ گئے تھے
حامد یزدانی

پیری بھی تھوڑی حوصلہ افزائی ہو گئی
جاتے ہوئے وہ میرا بھی شانہ تھپک گیا
احمد حسین مجاہد

یاد کا کیل نکالا نہ گیا جب میں نے
دل کی دیوار سے تصویر اُتاری اُس کی

☆

اب تو ہر شخص کم و بیش اسی خوف میں ہے
کھل نہ جائے کہیں رستے میں پٹاری اُس کی
راحت سرحدی

یونہی رہے گی سدا کش مکش تو یوں ہی سہی
ہوا کا اپنا مقدر، دیے کا اپنا نصیب
داجدا میر

جو آگہی ہو تو پھر کچھ پہیلیاں بھی رہیں
دلہن کے گرد دلہن کی سہیلیاں بھی رہیں
جمشید چشتی

گذرا بھی نہیں قریب سے وہ
مٹی بھی اُڑا گیا ہماری
شاہین عباس

جانے کس گردش نے اُس کو حال سے یوں بے حال کیا
دیکھ کے اُس کا اُترا چہرہ میری تو بھر آئی آنکھ
اقبال سرویہ

کل رات ابرِ غم کے حوالے نہ مل سکے
کل رات بھی شمار کو اکب نہ ہو سکا
شفیق آصف

خود کو پتوں میں چھپاتے ہیں وہ پنچھی جن کو
آگ جنگل میں لگی ، کاٹ کے پر چھوڑ دیا
اکرم کنجاہی

یہ مت سمجھ کہ مجھے کچھ خبر نہیں تیری
فقیر پوچھتا رہتا ہے سب سے حال تیرا
ریاض رومانی

کس کی اجازت سے تو نے
میرے زیاں کو سود کیا
حسنین سحر

تلاشِ نان و نمک میں ہے خلق سرگرداں
کتاب حکمت و اسرار کون دیکھتا ہے
شہاب صفدر

ہوائے شہر سے مل کر وہ بھول بھال گیا
کہ منتظر کسی گاؤں میں بام و در تھیں مرے
خورشید ربانی

روز آتی ہے مجھے خواب میں ملنے کے لئے
یاد کی جھیل کے اُس پار پری رہتی ہے
اشرف کمال

میں کیسے مان لوں منصف کی منصفی کہ اُسے
پھٹا ہوا مرا کرتا سمجھ نہیں آیا
صغیر احمد صغیر

بکھر کر رہ گیا شیرازہ میرا
دھرے سب رہ گئے اسباب میرے
رمزی آثم

میں آٹھ سال سے ان وادیوں میں رہتا ہوں
یہ کوہ قاف ہے لیکن پری نہیں آتی
اسحاق وردگ

ایسی تھی کھینچ تان کہ سب خواب پھٹ گئے
ایسی خبر تھی خود سے بھی جو بے خبر گئی
سعدیہ بشیر

ایک خالی سا رکھا ہے ذہن کوئی
مجھ کو شانوں پہ یہ سر نہیں چاہیے
رخشندہ نوید

اداکاری بہت مہنگی پڑی ہے
حقیقت میں بھی مرنا پڑ گیا ہے
شہزاد احمد شیخ

مرے احساس کے سینے میں اک خنجر اُتارا تھا
جسے میں جان کہتا تھا اُسی نے جان سے مارا تھا
آفتاب خان

چمک اُٹھی تھی وہیں پر نگہ مسافر کی
جہاں دکھائی دیا تھا چراغ جلتا ہوا
محمود راشد

جس نے پڑھ رکھی ہے مکّے سے مدینہ ہجرت
وہ امانت میں خیانت نہیں کرنے والا
سعید راجا

نوائے صورِ سرافیل سے ہی جاگے گی
ہماری مردہ ضمیری اگر کبھی جاگی
شاہد ماکلی

چھاؤں مانگی ہے درختوں کی نہ باد و باراں
جب بھی مانگا تری دیوار کا سایہ مانگا
دانش عزیز

قصے تخلیوں کے بہت کم ہوئے بیاں
تشدید میں مزید کرو ایک اور شد
فرخندہ شمیم

یہ زمانے کا چلن ہے تو شکایت کیسی
جس کو سینے سے لگاؤ وہ گلے آتا ہے
محمد حفیظ اللہ بادل

ہیں ایسے لوگ جو دل میں دعا نہیں رکھتے
وہ اپنا ظاہر و باطن بُرا نہیں رکھتے
اعجاز روشن

کنارا خود نہیں ملتا کنارا ڈھونڈ لیتا ہوں
بسا اوقات تنکے کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہوں
طالب انصاری

میرے لئے اپنی ہی زمیں، خلدِ بریں ہے
کم تر تو نہیں خاک وطن، خاک شفا سے
شوکت محمود شوکت

کیا جانے کس طرف مجھے لے جائے بے خودی
اے دشتِ شوق! میں تو ترا یار بن گیا
جاوید صدیق بھٹی

ایک دنیا میں ہے وجود مرا
ایک دنیا مرے وجود میں ہے
نوشابہ ہاشمی

وہ جل کر راکھ ہو جائیں گے آخر
جو پیہم آگ سے ٹکرار میں ہیں
عاطر عثمانی

ریت پر رکھی ہوئی تھی برف پانی بن گئی
اک خیال آیا تصور اور کہانی بن گئی
تصور اقبال

کبھی مقبول خلعت کی تمنا کی نہیں میں نے
کہ یہ درویش تو بس اپنی ہی چادر میں رہتا ہے
سید مقبول حسین

مر جاؤں نہ کیوں پھر سرِ بازار گری ہے
روٹی کی طلب میں مری دستار گری ہے
رضا اللہ حیدر

ہم نے تاریکیوں سے ہاتھ ملانا سیکھا
ہم چراغوں کو بجھانے کا ہنر سیکھ گئے
عقیل رحمانی

عابدی تجھ سے شاعری ہے بعید
میں نقطہ لفظ کو اجالتا ہوں
علی حسین عابدی

پھر آئنے سے آج مرا سامنا ہوا
اور یوں ہوا کہ آئنہ حیران ہو گیا
افتخار شاہد

سانپ نے ڈس لیا شکاری کو
جب نشانہ کیا کبوتر کا
محمود کفی

کتنی شرمیلی ہے لڑکی گاؤں کی
اندھوں سے بھی اپنا آپ چھپاتی ہے
انصر حسن

کیسے چپ چاپ ہوئے دل کے مکیں
کیسا اجڑا یہ نگر شام کے بعد
بشیر احمد حبیب

یہ چہرہ اور چہرہ ہے ثمینہ
مری صورت پرانی کھو گئی ہے
ثمینہ سید

ہم زندگی کی دوڑ میں ماضی سے کٹ گئے
عکسِ خیالِ یار مٹایا نہ جا سکا
طلعت شبیر

دل کو ہر پل یہی دھڑکا سا لگا رہتا ہے
چھین لے کوئی نہ ہم سے یہ بچائے ہوئے لوگ
طاہر ناصر علی

پیاس بجھتی نہیں ہے پینے سے
بھر گیا ہے وہ تشنگی مجھ میں
زبیر فاروق

اداسیوں کو شکست دے کر
مسرتوں کو بحال رکھو

ہمایوں پرویز شاہد

محرومیوں پہ نوحہ کناں، جوہر حیات
مٹی میں اپنے لعل و گہر رولتا بدن

فیض رسول فیضان

دیے کی آنکھ سے دیکھا ہے پھول کا چہرہ
نظر میں لو کسی صورت کی جھلملانے لگی

اکرم جاذب

زمیں کی ناؤ سے باہر نکل کر میں کہاں جاؤں
مرے چاروں طرف پھیلا ہوا پانی ہی پانی ہے

سرور فرحان

چرخِ سخن پہ بجھنے لگے جب مرے حروف
خونِ جگر سے شعر کی تاثیر مانگ لی

حکیم خان حکیم

میری آنکھوں کی سبز کھیتی میں
اک ترے خواب کی نمو ہے ابھی

عزیز عادل

اک حور کی مانند وہ لگتی تھی سراسر
جنت سے جسے رب نے اُتارا بھی نہیں تھا

سید ضیا حسین

درمیانِ چراغ و موجِ ہوا
جو بھی ہے مسئلہ، نہیں معلوم

محمد امجد حسین

سرخ دیوار پہ ہری بیلیں
درمیاں پھول جیسا دروازہ

امر سنگھی

بستیاں ہیں کہ سبھی غرق ہوئی جاتی ہیں
اور ملہار وہ گاتا ہی چلا جاتا ہے

عطاء العزیز

نقش و تشہیر سے گر مجھ کو عیاں ہونا ہے
اس سے بہتر مجھے بے نام و نشاں ہونا ہے

سہیل یار

گلِ حیات کھلا ہے انہی کے ہونے سے
کہ یہ ہوائیں بہت کارگر ہوائیں ہیں

زاہد محمود زاہد

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

خالد احمد

میں اس لیے بھی تری خیر مانگتا ہوں بہت
تمام شہر میں تجھ سا حسیں نہیں مرے دوست

طارق جاوید

کبھی مشکل کبھی وہ شخص آسانی بناتا ہے
جدھر ہو آگ کا دریا اُدھر پانی بناتا ہے

اسد رضا سحر

کسی بھی چیز سے بجھتی نہیں تھی پیاس مری
ہزار بار تو پانی بھی آزمایا ہے

عزم الحسنین عزمی

ہوا کے زور سے گر تو گئے درخت مگر
پرندے پھرتے ہوئے بے امان کیسے لگے

سجاد حسین ساجد

وہ گرم ہاتھوں سے برف پتلے بنا رہی تھی
جو بن چکے تھے وہ پھر بکھرنے کے منتظر تھے

عاطف جاوید عاطف

یہ خطرناک علاقہ ہے محبت کے لیے
اپنے ہمراہ مجھے اتنا زیادہ نہ پھرا

اسد اعوان

ذات اپنی میں نے خود تعمیر کی
عشق کے ہی اینٹ گارے سے شہاب

شہاب اللہ شہاب

کیوں کسی رام کہانی کی شروعات کریں
آ؟ مل بیٹھ کے اپنی ہی کوئی بات کریں

عمر قیاز قائل

اپنی بیٹی کا جنم دن وہ منائے گا کب
بیچتا ہے یہ جو گلیوں میں غبارے اکثر

آفتاب محمود شمسی

کیا ہوا ہے مرا نقصان کہاں سمجھے گا
ہائے وہ زود پشیمان کہاں سمجھے گا
فرہاد ترابی

آفت آ کر ٹل جائے گی
ماں کے لب پر حرفِ دعا ہے
وسیم جبران

کتنے ہی رنگ بدلتی ہے زمیں کی حرکت
آسماں کوئی دھماکا نہیں کرنے والا
امجد بابر

وہ ترے فقیر کی جھونپڑی ہے یہیں کہیں
وہ بلند بام عمارتیں وہ کلس گئے
اصغر علی بلوچ

خموشی ہے سبھی پر خوف طاری ہے
غنیمت ہے کوئی آہٹ اگر آئے
احمد محمود

ایسا لگتا ہے ہر اک آنکھ مجھے دیکھتی ہے
ایسا لگتا ہے ہر اک شخص تماشائی ہے
نادیہ سحر

کل شب مرے حواس پہ طاری رہا کوئی
آتے رہے کسی کے خیالات دیر تک
جیا قریشی

محسن تند ہواؤں میں بھی ایک دیا
دریا کے ساحل پر جلتا رہتا ہے
میتھو محسن

ذات میری ہے ایک ویرانہ
اور پھر شور ہا و ہُو تو ہے
زین علی رضوی

تیری تصویر سے مخاطب ہوں
لے کے میں اپنی ذات کا رونا
نعمان حیدر حامی

تماش بین سمجھتے رہے کہ کرتب ہے
چلی گئی تھی حقیقت میں جاں مداری کی

☆

مسلک سے ماورا کوئی مسجد بناؤں گا
جس میں سبھی نماز محبت ادا کریں
نثار محمود تاثیر

کیمرہ وقت کی رفتار دکھاتا ہے مجھے
اب مری عمر سے تصویر بڑی بنتی ہے

☆

رنج میں کچھ کمی تو کی ہم نے
دیکھئے شاعری تو کی ہم نے
جاناں ملک

یہ میری خوش نصیبی ہے یہ فیاضی ہے قدرت کی
فدا اُس جانِ رحمت پر دل و جاں سے فدا ہوں میں
ابو طاہر فدا حسین فدا

آخر میں برادرِ محترم و مکرم جناب نعمان منظور صاحب کے لئے دعائے صحت، پاک پروردگار مالک و مولا جلّ وعلا اپنے حبیبؐ پاک کا صدقہ، اُنہیں شفائے کاملہ عاجلہ عطا فرمائے - شکریہ والسلام-

---

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم
ماہ فروری کا شمارہ ملا- یوم یکجہتی کشمیر کے حوالے سے خوبصورت پاکستان اور کشمیر کے جھنڈوں سے آراستہ-
حسب سابق منتخب غزلوں نظموں اور مضامین کا خوبصورت گلدستہ پیش کیا گیا ہے-
آغاز میں جناب خالد احمد کی غزل کے اشعار الفاظ و معنی کے نئے در کھولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں- مطلع تو خوب ہے

منظر تھے دھیان مین لبِ جو کس دیار کے آنکھوں میں تیرنے لگے بجرے خمار کے

اس غزل میں لب جو، تیرنے، بجرے، غم، انکسار، رستے، نجات، فرار، چہرے، نقش، منجنر لوحِ مزار، روح، جیسے الفاظ ایک سمت نمائی کرتے ہوئے ادیب کو ان مراحل کی نشاندہی کرتے ہیں جو اسے امر کر دیتے ہیں۔

حسن عسکری کاظمی کا حمد یہ شعر دنیا کے فریب اور اس سے نجات کے راستے کی عکاسی کرتا ہے۔

اچھا ہوا کہ دل میں فقط تیری یاد ہے اس مکر و فن کی دنیا کو دل سے بھلا دیا

درج ذیل غزلیہ اشعار خوب ہیں۔

ان اشعار میں سماجی حوالے سے کچھ موضوعات ہیں جنھوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی:

عبادتیں تو بہت کی ہیں شیخ جی تم نے
تمھاری ذات سے بندوں کو فیض کیا پہنچا
انور شعور

کردار کی توفیق ہو تو جگ میں ہے عزت
عزت ملی مجھ کو بھی بہت حسن طلب سے
آصف ثاقب

عکس ہوتا ہے اس گھڑی بھی جب
سامنے آئنہ نہیں ہوتا
امجد اسلام امجد

دیکھی نہیں ہے جس نے مری پاک سرزمیں
وہ آشنائے عکسِ بہشتِ بریں نہیں
جلیل عالی

ساری ہوا کو ایک جگہ جمع کر کے میں
بچے کے کھیلنے کو غبارہ بناؤں گا
نسیم سحر

سکون بانٹتا ہے بے غرض جو راہی کو
اسی شجر کو سدا سایہ دار دیکھا ہے
سید ریاض حسین زیدی

مل بیٹھ کر جہاں نہیں رہتے گھروں کے لوگ
لگتا نہیں کہ شہر کا نقشہ درست ہو
صفدر صدیق رضی

زمیں کا بوجھ سمجھ کر گرا نہیں دینا
کہ چھاؤں بانٹنے والے بھی کچھ شجر ہیں مرے
خورشید ربانی

یارب تری زمین تو صدموں سے بھر گئی
روشن سے دن میں دشت کی وحشت اتر گئی
سعدیہ بشیر

آؤ کہ حرف نحو میں اک تجربہ کریں
تختی کے سب حروف میں ڈالیں مزید مد
فرخندہ شمیم

کوئی امید دل میں جاگی ہے
چھن رہی ہے جو روشنی مجھ میں
زبیر فاروق

گلزار بخاری، جمیل یوسف، خاور اعجاز، اکرم ناصر، شہاب صفدر، شفیق آصف، اقبال سروبہ، زین علی رضوی، رخشندہ نوید، وغیرہ سب کی نظمیں اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے خوب ہیں۔ شعرا اور بھی اچھے ہیں، نظموں، مضامین، مائیکرو فکشن، خطوط اور آپ بیتی کے حوالے سے بھی تبصرہ تفصیلی وقت مانگتا ہے۔ بیاض کی وساطت سے ہم ادب کی رفتار سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں۔ دوستوں سے آدھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ آپ اسی طرح بیاض کے شمارے ترتیب دیتے رہیں کشتِ ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ آمین

محمد انیس انصاری

معظمی عمران منظور، نعمان منظور صاحبان

مدیر و معاون مدیر ماہنامہ بیاض، لاہور

السلام علیکم رحمتہ اللہ برکاتہ

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

دو ماہ سے آپ کے ساتھ رابطہ منقطع رہا۔ عارضۂ قلب کے باعث گزشتہ ماہ سے بیڈ پر ہوں۔ جنوری کے اوائل میں 'بائی پاس' کے جاں گسل مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ الحمدللہ اب

کافی بہتر ہوں۔ اس عرصہ میں لکھنے پڑھنے سے بھی جی اُچاٹ رہا۔ زیادہ دیر تک جُھکنے اور لکھنے پڑھنے سے سینہ چاک دُکھنے لگتا ہے۔ نقاہت کسی حد تک ساتھ چل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو ماہ تک بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی۔ شکر ہے دل کے زخم بھر رہے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

بستر آرامی کے عرصہ میں "بیاض" میرا مونس و ہمدم رہا۔ ایک کام جو بستر پر لیٹ کر ممکن تھا، وہ مطالعہ تھا۔ سو "بیاض" لفظ بہ لفظ پڑھتا رہا۔ اچھے اشعار کا انتخاب حسبِ عادت کرتا رہا لیکن صحت ان کو 'کوٹ' کرنے کی متحمل نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ ہمدمِ دیرینہ غلام حسین ساجد اور علی اصغر عباس کی شاعری نصف صدی کی یادیں تازہ کر دیتی ہے۔ غلام حسین ساجد 73-1971 کے عرصہ میں اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں میرے کالج اور ہوسٹل کے رفیق رہے۔ پروفیسر شہرت بخاری کی صحبت میں ادبی زندگی کا اوائل حصہ بھی ہم نے مل کر گزارا۔ بعد میں بھی گاہے گاہے ان کے آبائی گاؤں تلمبہ سے کچھ یادیں وابستہ ہیں۔ علی اصغر عباس سے متعلق ان کے بھائی علی اکبر عباس کے حوالے سے ہے، جن سے دوستی کا عرصہ بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ ظہور چوہان کی شاعری بھی اس کی سحر انگیز شخصیت کی طرح نکھری ہوئی ہے۔ ابھی اور بہت سے احباب اور اہلِ قلم کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں مگر صحت گوارا نہیں کر رہی۔ یار زندہ، صحبت باقی۔ سدا سلامت رہیے، سدا خوش رہیے۔

آپ کا دیرینہ

طالب انصاری

برادرِ مکرم جناب عمران منظور صاحب

مسنون سلام اور بہت احترام

"بیاض" کا شمارہ بابت ماہ فروری 2022 موصول ہوا۔ جذبات امتنان قبول فرمائیے۔

جمیل یوسف صاحب نے اپنے مکتوب میں 'بیاض' کی پانچ خصوصیات بہت بسیط انداز میں بیان کیں۔ بے شک 'بیاض' واحد ادبی رسالہ ہے جو وقت پر شائع ہوتا ہے اور بہت وقیع ادبی مواد لیے جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں آپ کے حسنِ ادارت کی داد نہ دینا بخل کے زمرے میں آتا ہے۔ جمیل یوسف صاحب نے غالب کی ایک غزل کے حوالے سے اچھی تنقیدی بحث پیش کیں۔ مگر ان کا یہ کہنا کہ غالب کی اس پوری غزل کی فکریات حمد و نعت پر مبنی ہیں، شاید درست نہیں ہے۔ جمیل یوسف صاحب نے غالب کی غزل کے جن اشعار کا انتخاب کیا وہ بے شک نعتیہ یا حمدیہ مفاہیم پر پورے اترتے ہیں اور حسنِ عرق ریزی کے ساتھ جمیل یوسف نے ان اشعار کو سمجھا ہے وہ قابلِ داد ہے اور ان کی شعر فہمی کی دلیل ہے، مگر اسی غزل کے درج ذیل اشعار کی نعتیہ یا حمدیہ تفہیم کے حوالے سے جمیل صاحب کیا فرمائیں گے۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں امد
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غزل میں بسا اوقات ایسے اشعار کا نزول بھی ہو جاتا ہے، جن کی نعتیہ تفہیم بھی کی جا سکتی ہے، تاہم اس بنیاد پر ہم تمام غزل و نعتیہ غزل نہیں کہہ سکتے۔

عامر رضوی اور شاعر علی شاعر کے پروین شاکر اور انور شعور کی شعری فکریات پر مبنی مضامین بھی بہت پسند آئے۔ 'بیاض' کا یہ اختصاص ہے کہ ڈھیر ساری اور اچھی شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ پسند آنے والے اشعار لکھوں تو خط بہت طویل ہو جائے گا۔

رضا اللہ حیدر کی غزل کے دوسرے شعر میں لفظ گھائل لکھا گیا۔ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے اور ہندی حروف تہجی میں ہمزہ نہیں ہے۔ اس لفظ کا صحیح املا گھایل ہے۔ ''نظمیں بھی اچھی تھیں۔ اگرچہ میں نثری نظم کا قائل نہیں ہوں البتہ دروانہ نوشین خان کی نظم کا متن بہت متاثر کن تھا۔

افسانے بھی بہت عمدہ تھے۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا افسانہ ''گودی'' بہت دل گداز اور پُرتاثیر افسانہ تھا، مگر اس کا انجام حقیقت سے کچھ دور لگا۔ ڈیڑھ سال کے بچے کا اکیلے قبرستان میں اپنی ماں کی قبر پر سوجانا بعید از عقل ہے بھلے بچہ جنازے کے ساتھ ہی قبرستان گیا ہو۔ ڈیڑھ سالہ بچہ چلتے ہوئے لڑکھڑاتا ہے۔ اس لیے سچ سچ چلتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ جنازے میں شامل کسی شخص کا اس معصوم پر توجہ نہ دینا بھی عجیب سا لگا۔ اسی لیے یارڈ کپلنگ نے کہا تھا کہ افسانہ جھوٹ ہوتے ہوئے بھی سچ ہوتا ہے اور سچ ہوتے ہوئے بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر افسانے کا انجام بھی واقعاتی سطح پر جھوٹ ہے اور بچے کی ماں سے محبت افسانے کا سب سے بڑا سچ ہے۔

والسلام

ہارون الرشید

محترم عمران منظور، نعمان صاحب!

السلام علیکم!

''بیاض'' کا نئے سال کا دوسرا شمارہ بے حد دلنواز ہے۔ ٹائٹل یوم یکجہتی کشمیر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ کشمیر کی مخلوق اور اس کے باسیوں کی اذیت ناک زندگی تمام اہل وطن کے لیے نہایت تشویش کا باعث ہے۔ بشریٰ رحمٰن کا ''گودی'' پڑھا ہی تھا کہ ان کے گزر جانے کی خبر آگئی بے حد رنج ہوا شوکت علی شاہ کی ''شاہ داستان'' افتقار کی بے رحم غلام گردشوں کا نوحہ ہے۔ وہ ہر ماہ نت نئے واقعات لے کے آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا انٹرویو اچھا لگا۔ انور شعور کی غزل پہ شاعر علی شاعر نے محمد مضمون تحریر کیا ہے۔ پروین شاکر کو اس جہاں سے گئے ستائیس برس گزر گئے۔ ان کی سحر انگیز شخصیت اور فن کے چند گوشے عامر رضوی نے نہایت دل نشیں انداز میں ہمارے سامنے رکھے ہیں۔

شاہد ماکلی ہر ماہ نوجوان شعرا کو سامنے لا رہے ہیں۔ یہ اہم کام ہے۔ خورشید رضوی، امجد اسلام امجد اور احمد جلیل کی نظمیں متاثر کن ہیں۔ گوشہ غزل تمام تحریروں پر بھاری ہے۔ آصف ثاقب، نسیم سحر اور آفتاب احمد ملک نے ناچیز کے مضمون کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اس کے لیے ان کا بے حد ممنون ہوں۔

آفتاب خان

محترم عمران منظور، نعمان منظور، اعجاز رضوی

السلام علیکم!

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

فروری کا 'بیاض' بروقت مل گیا۔ سرورق کشمیر ڈے کے حوالے سے تھا، جس میں پاکستانی پرچم کا ڈنڈا الٹی طرف لگا دیا گیا۔ خیر مندرجات کی طرف بڑھے تو کئی تحریروں نے سرشاری سے ہمکنار کیا۔ سلیمان عبداللہ ڈار کی تحریر، بشریٰ رحمٰن، حبیب الرحمٰن، نوین

روما کے افسانے، حامد یزدانی قرۃ العین حیدر سے مکالمہ۔ جمیل یوسف کا غالب کی ایک غزل پر مضمون۔ شاعر علی شاعر کا انور شعور کی شاعری کا جائزہ۔ سعدیہ بشیر کی مزاحیہ تحریر، ممتاز راشد لاہوری کا خمستان سرمدی پر اظہاریان سب نے لطف دیا اور ان سے حظ اٹھایا۔

شاعری میں حمد و نعت کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سب نے اپنی اپنی حیثیت سے خوب لکھا۔ غزل میں ایک سو چار شعرا کی غزلیات شامل ہیں۔ کچھ اشعار نے دل کھینچ لیا۔ وہ درج کر رہا ہوں:

دکھا تو دوں کہ مرے دل پہ زخم کتنے ہیں
مگر کسی کی عنایات کا شمار تو ہو
خالد احمد

آپس میں کہیں آنکھ ملاتے ہی نہیں ہم
جذبات بھی ایسے ہیں کہ لگتے ہیں عجب سے
آصف ثاقب

مجھے جگا کے وہ آرام کر رہے ہوں گے
مری دعا انھیں اے صبح کی ہوا پہنچا
انور شعور

گزری تمام عمر اسی سرد گرم میں
اوپر فلک نہیں، کبھی نیچے زمیں نہیں
جلیل عالی

بحر کو یہ دھن کہ ساحل کو بھی بڑھ کر کھینچ لے
موج کا یہ عزم ہے، بیرون دریا جائے ہے
جمیل یوسف

شامل کروں گا اپنا بدن اور روح بھی
اب کے مجسمہ جو تمھارا بناؤں گا
نسیم سحر

ہر اک نتیجۂ تحقیق سے یہ علم ہوا
کہ ابتدا میں ہے تسخیرِ کائنات ابھی
سید قاسم جلال

دیوار آ گئی کوئی سورج کے سامنے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ سایہ ہے دھوپ کا
گلزار بخاری

بے شک وہ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہو مگر
شیریں زبان ہو، لب و لہجہ درست ہو
صفدر صدیق رضی

سوچتا ہوں کہ کتابوں میں رکھوں یا دل میں
پھول بھیجا ہے کسی چاہنے والی نے مجھے
باقی احمد پوری

کبھی نیندیں کبھی خواب پرونے میں گئی
زندگی اپنی تو سامان ہی ڈھونے میں گئی
خاور اعجاز

جس طرف دیکھیے، آگ کا کھیل جاری ہے افلاک پر
اب ضرورت نہیں ہے مرے مہربانوں کو چقماق کی
غلام حسین ساجد

آخری حکم ہے، تعمیل تو کرنی ہوگی
چاہے جیسا بھی ہو نقصان مجھے چلنا ہے
حسن عباس رضا

روز آتی ہے مجھے خواب میں ملنے کے لیے
یاد کی جھیل کے اُس پار پری رہتی ہے
اشرف کمال

میں آٹھ سال سے ان وادیوں میں رہتا ہوں
یہ کوہ قاف ہے لیکن پری نہیں آتی
اسحاق وردگ

نہ گھیرے سکتے سے پھر قصہ گو نکل پایا
نہ داستان میں سوئی ہوئی پری جاگی
شاہد ماکلی

آخر الذکر تین اشعار میں پری کی موجودگی شاید حسنِ اتفاق ہے۔

فقط والسلام

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

فروری کا سرد ورق کشمیر کے ساتھ ہماری محبت اور وابستگی کا ترجمان تھا۔ اب تو بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ تعلیمی اداروں میں مسلمان طالبات کو بغیر حجاب کے آنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ سیکولر بھارت کی یہ حرکتیں قائداعظم اور اُن کے رفقا کے دوقومی نظریے کی سچائی کی تصدیق کر رہی ہیں۔ مسکان خان نے درجنوں انتہا پسندوں کے سامنے نعرۂ تکبیر بلند کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اسی ٹیپو سلطان کی ریاست میسور (موجودہ کرناٹک) کی بیٹی ہے۔

اُردو ادب کا بڑا نام بشریٰ رحمٰن بھی ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ لاہور میں کئی تقریبات میں اُن کی شخصیت کو دیکھنے اور اُن کی گفتگو سننے کا موقع ملا۔ ان کا افسانہ ''گودی'' آنکھیں نم کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ ماں کی انمول محبت ہے کہ انسان دنیا کے ہر رشتے، ہر رنگ کو بھول جاتا ہے، یاد رہتا ہے تو ماں اور اس کا پیار۔ اسی لیے ننھا منور میر کہیں اور نہیں ملا، ملا تو ماں کی قبر کے ساتھ۔ بشریٰ آپا نے محبت کے لطیف احساسات سے گندھا افسانہ لکھا۔ حامد یزدانی کا قرۃ العین حیدر کا انٹرویو بھی دلچسپ ہے۔ ویسے یہی آپا کی پاکستان چھوڑنے کی وجہ والی بات گول مول ہو گئی۔ عامد صاحب کو ان سے پوچھنا چاہیے تھا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم بھی پاکستان کی محبت میں بھارت چھوڑ کر آنے والوں کو وہ محبت نہیں دے سکے۔ جس کے وہ حقدار تھے۔ شاعرِ امروز کے تحت ہر دفعہ دو نئے شاعروں کا تعارف و کلام شائع کیا جاتا ہے۔ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے 'بیاض' کا یہ احسن اقدام ہے۔ اس دفعہ شاہد ماکلی نثار محمود تاثیر اور جاناں ملک کے کلام کے ساتھ موجود تھے۔ افتخار شفیع کی دو ادبی کتابوں پر جمیل احمد عدیل نے دلچسپ جائزہ پیش کیا۔ جمیل صاحب ہمارے لیے اساتذہ کی طرح ہیں۔ ان کی تحریر سے ہمیں نئے نئے الفاظ پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

شاعر علی شاعر کی انور شعور پہ اور عامر رضوی کی پروین شاکر پہ خوبصورت تحریریں تھیں۔ پروین شاکر کی جوانی کی موت ہی ان کا حوالہ بن گئی۔ عامر رضوی نے جاں کیٹس اور پروین شاکر کے اس حسین حوالے کا بھی خوب ذکر کیا۔ اس دفعہ 'بیاض' کے یہ اشعار بہت پسند آئے:

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو
خالد احمد

ہے شک وہ لکھنؤ سے نہ دلی سے ہو مگر
شیریں زبان ہو، لب و لہجہ درست ہو
جو کچھ کسی کے سامنے کہنا محال ہے
ایسا نہیں کہ وہ پسِ پردہ درست ہو
صفدر صدیق رضی

ہو گا دیکھو، یہیں کہیں موجود
کوئی لمحہ فنا نہیں ہوتا
اس کو ملتا نہیں وہ باہر بھی
جس کے اندر خدا نہیں ہوتا
امجد اسلام امجد

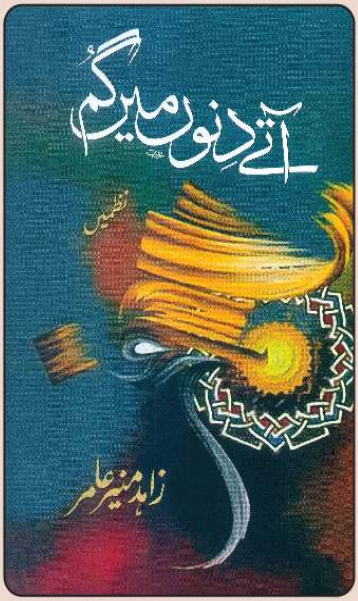

دِل آثار
انیس احمد

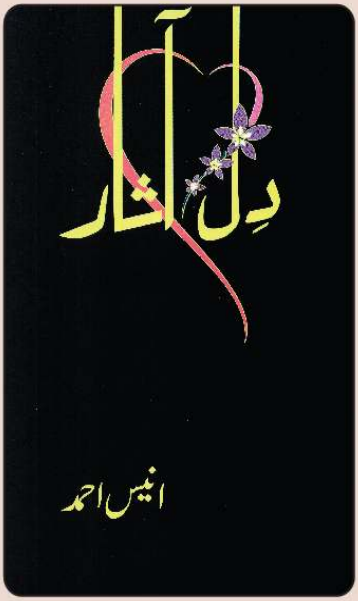

آتے دِنوں میں گم
نظمیں
زاہد منیر عامر

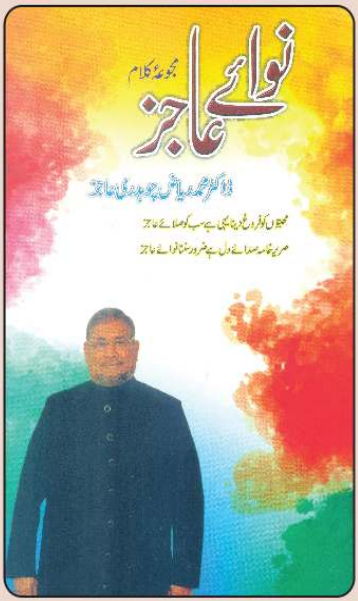

کوئے ظرافت
ڈاکٹر انعام الحق جاوید

نوائے عاجز
مجموعۂ کلام
ڈاکٹر محمد ریاض چوہدری عاجز

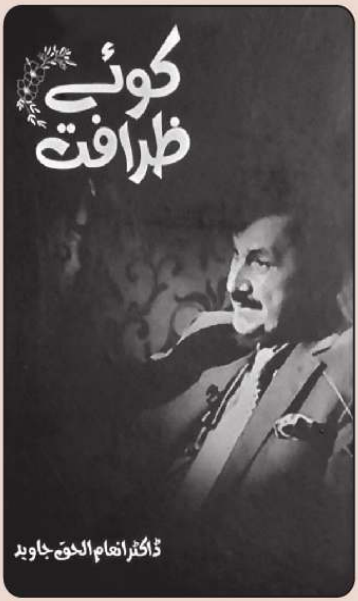

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888